www.taemeernews.com
ایک
حلفیہ
بیان
اقبال مجید

ایک حلفیہ بیان

اور

۱۵

دوسرے افسانے

اقبال مجید

تقسیم کار
نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

ایک حلفیہ بیان

اقبال مجید

کے ۱۶ افسانے

قیمت

۲۰ روپے

نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

یہ کتاب فخرالدین علی احمد یادگار کمیٹی
حکومتِ اُتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

• ناشر : اقبال مجید۔ آل انڈیا ریڈیو۔ بھوپال
• کتابت : شہید صفی پوری
• طباعت : نامی پریس۔ لکھنؤ
• قیمت : بیس روپے
• تعداد : پانچ سو

فہرست

شہر معنی:

دشت معنی:

کچھ غیر ضروری باتیں

کوئی مخصوص اسٹرکچر (Structure) کسی خاص فنکشن (Function) کو ہی ادا کرپاتا ہے۔

کچھ لوگ کہانی سے کسی سادھو کی سمادھی والے لوہے کی کیلوں جڑے تختے کا کام (Function) کرنا چاہتے ہیں اس لیے اُس کو ویسا ہی بنا کر اُس پر قاری کو لٹا دیتے ہیں۔

کچھ کے لیے کہانی کا کام گھانس چھیلنا ہے۔ اس لیے وہ کہانی کا بھدّا سا موٹی دھار والا کھرپا بناتے ہیں اور گھانس چھیلتے رہتے ہیں۔ نہ تو پہلے والے کے لیے کھرپا اُس کے کام کا اسٹرکچر ہے اور نہ دوسرے والے کے لیے کیلوں جڑا تختہ۔

مجھے کہانی کے لیے شیشہ چاہیئے، پارہ چاہیئے۔ پارہ کو گزرنے کے لیے ایک بے روک راستہ چاہیئے۔ ایسا راستہ جس کی سطح پر نشان ہی کے لیے کچھ

نمبر بھی پڑے ہوں۔ یعنی کہانی میرے لیے تھرمامیٹر کے آس پاس کی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ اس تھرمامیٹر کو کبھی ایسے بخار سے بھی سابقہ پڑے جب اُس کا پارہ ناکافی ہو یا پارے کا راستہ ناکافی ہو اور اس طرح تھرمامیٹر اپنا صحیح کام نہ کر سکے اور مجھے اس کے اسٹرکچر میں خاطر خواہ تبدیلی کرنا پڑے۔

یقین کیجیے اُس تبدیلی کی خاطر میں اپنے تھرمامیٹر سے ناراض ہو کر اُس کی نااہلی سے بددل ہو کر اُس کو کسی طور بھی کھُرپے میں نہیں بدلوں گا۔ اور نہ کیلوں بھرا تختہ ہی بناؤں گا — زیادہ پارہ مہیا کروں گا اور پارے کے لیے زیادہ بڑا راستہ بناؤں گا۔ اور وہ اس تبدیلی کے بعد بھی تھرمامیٹر کے آس پاس کی ہی کوئی چیز ہوگی۔

مجھے اُن لوگوں سے کوئی شکایت نہیں جن کے لیے کہانی سمادھی لگانے والا کیلوں کا تختہ ہے۔

اُن سے بھی کچھ نہیں کہنا جن کے لیے کہانی گھانس چھیلنے کا کھرپا ہے۔

وہ لوگ بھی قابلِ احترام ہیں جن کے لیے کہانی مکڑ جال ہے۔

اس لیے کہ ان سب ہی لوگوں کے ذہن میں پورے خلوص کے ساتھ کہانی کے فنکشن (Function) کے مطابق کہانی کا اسٹرکچر (Structure) متعین ہے۔

ادب کے کاروبار میں اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ اقبال مجید

تازہ منظر نامے

اقبال مجید چھٹی دہائی کے اوائل کے افسانوی دنیا میں متعارف ہوئے۔ پھر "دو بھیگے ہوئے لوگ" کی اشاعت نے اُن کی ادبی حیثیت میں چار چاند لگائے اور پھر پہلا مجموعہ اسی عنوان سے چھپا اور قدر شناسوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن آٹھویں دہائی کے درمیان پہنچتے پہنچتے اُن کا افسانوی نخل نئی زندگی سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس تبدیلی کا احساس مجھے ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ بھوپال میں ایک جگہ ادبی نشست کا اہتمام تھا۔ وہاں میں بھی شریک تھا۔ اقبال مجید نے اپنے مخصوص ڈرامائی لہجہ میں افسانہ "پیشاب گھر آگے ہے" سُنایا تو میں حیران ہوا کہ یہ وہی مصنف ہے جو پہلے پہل "عدو چا چا" کی تخلیق سے پہچانا گیا تھا۔ چنانچہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اس نئے مجموعہ کے بیشتر افسانے اپنی تخلیقی کیفیت میں ایک کروٹ بدلتے ہیں اور کروٹ کا یہ رُخ "تازہ منظر نامے"

کی طرف ہے۔

اقبال مجید کے یہاں بیانیہ کو طرح طرح سے آزمانے کا واضح رجحان ہے ایک طرف وہ بیانیہ کہانی کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں تو دوسری طرف تمثیلی اور علامتی افسانوں کی جانب گامزن نظر آتے ہیں۔ اظہارِ بیان کی جو مختلف النوع صورتیں افسانوں میں نمایاں ہیں اقبال مجید کی تکنیکی صلاحیتوں کی چغلی کھاتی ہیں۔ اُنھوں نے سیدھی سادی کہانی بھی کہی ہے (شرمندگی) اور ڈرامائی طرزِ تحریر بھی اختیار کیا ہے (ایک حلفیہ بیان) ظاہر ہے جب افسانے میں شاعری کی کرافٹ چل سکتی ہے تو افسانے میں ڈرامے کی کرافٹ بھی چلے گی۔ اُن کے یہاں وقفے وقفے سے جملوں یا پیراگرافوں کی تکرار بھی ملتی ہے اور ابتدائیہ و اختتامیہ کا انطباق بھی (ہائی وے پر ایک درخت)۔ کبھی کبھی تو ساری دیواریں جو قاری اور مُصنّف کے درمیان حائل ہوتی ہیں اُنھیں بڑھ کر مُصنّف خود ہی منہدم کردیتا ہے۔ پھر اُس کا مخاطب براہِ راست قاری ہوتا ہے (ایک حلفیہ بیان، پوشاک)۔ افسانوں میں جہاں کہیں انگریزی الفاظ جڑے ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ پر اظہاری قوت کی پرورش کرتے ہیں۔

"ایک حلفیہ بیان" اقبال مجید کے اور افسانوں کی طرح ایک ہی استعاراتی محور کے گرد رقصاں ہے۔ افسانے کا مرکز ایک کیڑا ہے جس سے مُصنّف (مُصنّف اور راوی میں یہاں امتیاز مشکل ہے) ایک فکری پیچ و تاب میں مبتلا

ہے۔ فکر بھی شدید ہے اور ردِ عمل بھی شدید۔ کیڑے اور مُصنّف کے درمیان کچھ من وتو کا سا رشتہ قائم ہے۔ مگر یہاں من و تو کا فرق مٹتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ (فرق کی پیدائش مصنّف کی زبانی گالیاں سُنانے میں پوشیدہ ہے)۔ یہی فرق ہے جس سے معنی کی تہہ داریاں خلق کی جاتی ہیں۔ مصنّف اور اس کے بالمقابل کے علاوہ خارجی صورتِ حال بار بار اُبھاری گئی ہے جو کیڑے جیسے کردار کو جنم دیتی ہے۔ اندھیرا' رات اور برسات۔ علاوہ بریں ٹیوب لائٹ کی روشنی ہے جو کمرے کی فضا پر مسلّط ہے اور یہ فضا جسے ہم غیر فطری بھی کہہ سکتے ہیں کیڑے کی گرفتاری کا سامان ہے۔ چکنا فرش کیڑے کو بے بس رکھتا ہے۔ اس کی ابتلا کے وقفے کو فزوں تر کرتا ہے اور اسی فرش کے باعث کیڑا مظلومیت کا شکار ہے۔ ایک ایبسرڈ صورتِ حال میں پھنسا ہوا ہے۔ لہٰذا کیڑا ایک طرف ہے جو مسلسل ابتلا کی تصویر ہے جس میں کبھی ہاتھ پاؤں چلانا ہوتا ہے اور کبھی صبر و تحمل آزمانا' دوسری طرف مُصنّف ہے جو کیڑے کی سعی ناکام پر جھلاہٹ کا شکار ہے اور اُسے برانگیختہ شکل میں جگہ جگہ استعمال کرتا ہے۔ مصنّف کی برانگیختگی کیڑے کی ناکافی تڑپ کے خلاف احتجاج ہے کہ وہ کیڑے کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے یا پھر یہ احتجاج چکنے فرش کے خلاف ہے جس کے باعث یہ صورتِ حال پیدا ہے۔ بہر حال وقفہ وقفہ سے اُبھرنے والی برانگیختگی ایک نئے بیانیہ کی تخلیق میں ڈھلتی ہے۔ یعنی حلف اُٹھانے کی زبان ہر بار

نئی جہت لیتی ہے۔ اس افسانے میں تین طرح کی بیانیہ لہریں اپنے آپ کو بدل بدل کر دہراتی ہیں۔ ایک حلفیہ بیان، ایک خارجی ماحول یا کمرے کے پس منظر کا بیان اور ایک کیڑے اور مصنف کے ردِ عمل کا بیان۔ اپنی اپنی جگہ پر ابتدائیہ اور اختتامیہ دونوں ہی حلفیہ بیان پر تمام ہوتے ہیں مگر اول اور آخر کا فرق ہے جسے بڑھتے ہوئے تخلیقی تناؤ کا آئینہ کہا جاسکتا ہے۔

"پیشاب گھر آگے ہے" بھی "ایک حلفیہ بیان" کی طرح لہروں کی تکرار سامنے لاتا ہے۔ اس میں بھی تین پیٹرن موجود ہیں۔ ایک راوی کا بیانیہ پیٹرن ہے، ایک بنیادی کردار کے سوال کا پیٹرن ہے غائب یا موجود کرداروں کے جواب کا پیٹرن۔ اقبال مجید کی فنکاری ان پیٹرن کی تخلیق میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہی مکالمے آگے آتے ہیں تو مزید اضافے کے ساتھ دہراتے ہیں۔ اس صناعی کی خوبی چھپتی چلی جاتی ہے۔ بر ایں ہمہ تناؤ کی شدت بھی کئی حساب بڑھتی جاتی ہے۔ راوی کا بیانیہ رُخ بھی جھلاتا، اپنی براگندگی کو ہوا دیتا آگے قدم اُٹھاتا ہے۔ پیشاب حیاتیاتی تناؤ کا نمونہ ہے جو فنی تخلیقی تناؤ کے ساتھ فیوز ہوکر ایک منظر، ایک خاصا بن گیا ہے۔ دوکانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اور راہ گیر اس رکاوٹ اور اس شدت کو کیا محسوس کریں گے خواہ یہ شدت حیاتیاتی یا تخلیقی سطح پر ہو خواہ داخلی یا فنی سطح پر — ایسے وقت فرد

فرد / فنکار محض اتنا جانتا ہے کہ "بہت دیر کا ٹھہرا ہوا پیشاب جب یکبارگی باہر نکلتا ہے تو جسم کے ایک ایک حصّہ کا تناؤ جس مسرت انگیز لذت کے ساتھ کم ہو جاتا ہے وہ لطف و طمانیت قدرت کا ایک عظیم تحفہ ہے"۔

وقت اقبال مجید کے یہاں کسی ایک استعارے میں نہیں ڈھلتا جس طرح قرۃ العین حیدر کے "فوٹو گرافر" میں، یا سریندر پرکاش، محمد عمر میمن، یا حمید سہروردی کے دو ایک افسانوں میں استعارے یا تلمیح کا روپ دھار لیتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی طرح اُن کے یہاں اکثر تاریخی تسلسل والا وقت موجود ہے۔ افسانوی حیثیت سے عصری سطح پر وقت کی تاریخی تہیں "خدا عورت اور بیٹی" میں نمایاں ہو کر کرافٹ مین شپ کی مثال پیش کرتی ہیں۔ مختلف ادوار کی تہیں ازلی وقت کی تہ میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہیں کہ آپس میں ایک crushing closeness کا پرتو اُبھارتی ہیں۔ کرافٹ مین شپ کے علاوہ اقبال مجید کے یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وقت کا ٹریٹمنٹ بھی بڑھتے ہوئے تناؤ کا نمونہ ہے۔

وقت کے واسطے سے دیکھیے تو اس سلسلے کا ایک افسانہ "ہانی وے پر ایک درخت" عجیب و غریب افسانہ نظر آئے گا۔ یہاں اتفاق سے اقبال مجید تکنیک کا وہی ملتا جلتا سلسلہ بروئے کار لاتے ہیں جو اوپر بیان میں آیا ہے (اقبال مجید کے افسانوں کا تکنیکی تنوع دیکھنا ہو تو ایک حلفیہ بیان"، "پیٹ

کا کچرا" "پوشاک" " دو بھیگے ہوئے لوگ" " مدافعت" وغیرہ پر ایک نظر ڈالی جا سکتی ہے، جن میں تکنیکی اختلاف کے علاوہ داخلیت اور خارجیت نیز اور الوالومنٹ غرض ہر طرح کی کوشش موجود ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ انوالومنٹ والے افسانے عموماً یکسانیت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ البتہ اقبال مجید کے یہاں تجربوں میں فنکار کی شمولیت کے باوجود افسانوں کی رنگارنگی قائم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی تجربے کی دنیا میں شامل ہونے کے بعد فن کار اُس کا پرتو اُتارتا ہے اور دنیا بدل دیتا ہے۔ یہاں سوال دنیا کو بدلنے یا نہ بدلنے کا ہے فن کار کی شمولیت کا نہیں۔

ہاں تو یہاں وقت اپنے برتاؤ میں ایک ایسا ڈائمنشن اختیار کرتا ہے جو پھانسی پر لٹکے ہوئے آدمی کا ذہنی وقت ہے۔ یہ بھی مرنے سے چند لمحے پہلے اور مرنے کے کچھ دیر بعد کا ذہنی وقت۔ مرنے سے قبل والا ذہنی عرصہ تو سبھی قبول کرلیں گے مگر فرد مرنے کے بعد بھی کچھ دیر تک ذہنی طور پر فعال رہ سکتا ہے یہ متنازعہ فیہ امر ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ افسانہ آگے بڑھ رہا تھا، تخلیق مزید زندگی مانگ رہی تھی ورنہ شاید تکمیل کو کبھی نہ پہنچتی! نفسیات یا ذہنی حیات کے طور پر یہ بات ممکن ہے یا نہیں اسے دانائے علوم یا ریسرچ اسکالرس طے کرتے رہیں افسانہ تو اپنی منزل طے کر چکا۔

بہرحال اقبال مجید اپنے افسانوں کے لہجے میں پختگی اور طمانیت کی

نمایاں پہچان قائم کرتے ہیں۔ پُرانی قدروں اور عصری حسیت کے تال میل میں قدیم اسلوب استعمال ہوتا ہے اور اُس میں بڑی خود اعتمادی جھلکتی ہے۔ جہاں تک نئی حسیت کا تعلق ہے اُس کے اظہار میں پرانے اسلوب کا استعمال بڑی محنت کا طلب گار رہتا ہے۔ اُمنڈتے ہوئے عصری دھاروں کو ایسے اسلوب میں ڈھالنے کے لیے جس کوشش اور جانفشانی کی ضرورت ہے ـــــ اُسے اقبال مجید جیسا پختہ فنکار ہی محسوس کر سکتا ہے۔ نئے فن کاروں کی یہ پیدائشی مشکل ہے کہ زبان کو عصریت کے تابع بنایا جائے نہ کہ عصریت کو کھینچ تان کے پُرانی زبان کے چوکھٹے میں بٹھایا جائے۔ اقبال مجید تو کم لیکن قاضی عبدالستار زیادہ اس کشمکش سے گریزاں ہیں۔ عصری حسیت کے تانے بانے بننا دشوار گزار مرحلہ ہے، یہی وجہ ہے میں نے اقبال مجید کے حالیہ افسانوں کو ایک نئی کروٹ سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال مجید کے بیانیہ کی بات مکمل نہ ہوگی اگر اُن کے افسانوی اسلوب میں موجود خشکی اور ٹھوس پن کا احساس نہ دلایا جائے کہ یہ اُن کی افسانوی ہیئت کی تشکیل کا اہم جزو ہیں۔ ایک پُر وقار فن کار کی نظر اسلوب کو جذباتیت سے ماورا کرتی ہے اور جذباتی معدومیت کے باوجود بھی اگر بیان کی بے ساختگی نمایاں رہے تو یہ ایک خوبی ہے۔ مہدی جعفر

شہرِ معنی

میراث

جب ٹیپو سلطان کا گھوڑا نئی ڈی نگر سے گزرا اور بان گنگا کے پل کے قریب پہنچا تو ایک جلیبی والے کو دیکھ کر گھوڑا اچھل گیا۔ تھکے مارے گھوڑے نے بہت دنوں سے جلیبیوں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ بدکا اور دولتیاں اچھالنے لگا۔ ٹیپو اپنے گھوڑے کو بہت چاہتا تھا۔ پس اُس نے جلیبی والے کو آواز دی اور آدھا کلو جلیبیاں اسی وقت خرید لیں۔ جلیبی والے نے ایک اخبار میں تول کر جلیبیاں دیں۔ ٹیپو اترا اور اپنے گھوڑے کو تازی تازی جلیبیاں کھلانے لگا۔ جلیبیاں ختم ہوئیں تو ٹیپو کی نظر اخبار کے ٹکڑے میں ایک خبر پر پڑی۔ ٹیپو کو خبر کی سُرخی نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ سرخی کچھ اس طرح تھی۔

"ولایت سے شیواجی کی تلوار بھوانی کی واپسی کا مطالبہ۔"

ٹیپو نے شیواجی کے چرچے مڈل اسکول میں سُن رکھے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ شیواجی بے جگر انسان تھا اور اُس کے توپ خانے میں مسلمان توپچیوں کو بڑے اچھے اچھے عہدے ملے ہوئے تھے جنھوں نے بہت سی جنگوں میں شیواجی کے

کے ساتھ میدانِ جنگ میں شجاعت کا ثبوت دیا تھا اور مغلوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے لیکن جہاں تک اُس کے علم میں تھا شیواجی کی تلوار ایک اچھی تلوار ضرور تھی لیکن اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کے کھو جانے پر افسوس کیا جائے۔ پھر یہ کہ شیواجی ایک سردار تھا اُس کے قبضے میں نہ جانے کتنی تلواریں رہی ہوں گی تو پھر یہ بھوانی کون سی تلوار تھی جس کی واپسی کے لیے......

یکایک ٹیپو سلطان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک دم سے اُسے ایک فلم یاد آگئی جو بنارس کے گھاٹوں پر پوجا پاٹ کرانے والے کچھ پنڈوں پر بنائی گئی تھی اور اُس میں ایک موٹا سا ٹھگنا سا آدمی ہاتھ میں ایک بھیانک سی تلوار لیے ایک مسافر کی گردن مارنے سے پہلے "جے بھوانی" کا ڈراؤنا نعرہ لگاتا ہے۔ قریب تھا کہ ٹیپو سنیما ہال سے اُٹھ آتا کہ اُس کے دوست نے اُس کو سمجھایا کہ یہ حقیقت نہیں فلم ہے۔

اُس دن بھی اُس کو بھوانی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا زبردست تجسس پیدا ہوا تھا اور رات کو وہ بدھوارے کے چوراہے پر یہی سوچ کر گیا تھا کہ بھوانی کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔

"کرن خاں ۔۔۔؟ یہ بھوانی کیا شے ہے؟" آخر کو اُس نے پہلی فرصت میں اپنے سب سے پہلے ملاقاتی سے جو ابھی ٹھیک سے تہمد سمیٹ کر پٹیا پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا یہ سوال داغ دیا۔

ٹیپو کا ملاقاتی ایک بردکاٹ پٹھان تھا۔ بڑھا ہوا شیو، ایک آنکھ قدرے چھوٹی، وہ ہمیشہ بیڑی اُلٹی جلا کر پیتا تھا اور کثیر الاولاد ہونے کے سبب زیادہ تر

گھر سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔ اُس کے کان میں لفظ بھوانی جیسے ہی پڑا تو اُس نے تیور بدل کر ٹیپو کی طرف دیکھا اور سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"سلطان کوئی اور بات کرو پٹھان۔ اپن کو اس لفظ سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔" سلطان نے بھی اپنے دل کی بات کہہ دی —

"پر دادا تجھے کیوں ڈر لگتا ہے؟"

سلطان کا ملاقاتی کوئی پچاس پچپن کے لپیٹے میں تھا۔ اُس کا کُل اثاثہ ایک کرائے کا مکان، ایک دُبلی پتلی گھوڑی اور ایک ٹوٹا پھوٹا تانگہ تھا۔ ریاست کے نوبت نقاروں کے درمیان اُس نے آنکھ کھولی تھی، اپنے شہر کی وہ چڑھائیاں جن پر وہ کسی زمانے میں پڑ کھبڑا سے ریلوے اسٹیشن تک ٹرین کے ساتھ ساتھ اپنا تانگہ دوڑاتا تھا اور ہمیشہ ریل گاڑی سے آگے نکلتا تھا، اپنے وطن کی وہی گھاٹیاں اب اُسے ڈراتی تھیں اور وہ اُن گھاٹیوں کو کھلے بندوں کوسا کرتا تھا۔

"بُرا کیا خان" — وہ بڑبڑایا۔ "قسم قرآن کی پان کی دکان رکھ لے پر تانگہ نہ چلائے۔" — اُس نے ایک آہ کھینچی — "کتنے دن چلے گی گھوڑی۔"

سلطان سب سُنتا رہا۔

"کتنے دن چلے گی گھوڑی؟ — اے خان چماروں سے بدتر ہیں، اُنھیں بینک لون دے دیتا ہے آٹو رکشا خرید لیتے ہیں۔"

سلطان سب سُنتا رہا اور سوچتا رہا بھوانی کے بارے میں کہ اُس کا ساتھی پھر گویا ہوا۔

"دن بھر اڈے پر کھڑا جانور اونگھتا رہتا ہے۔ شام کو گھر کیا لے جاتے ہو؟ بولو کیا لے جاتے ہو؟"

سلطان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

"دادا میں نے پوچھا تھا کہ تجھے بھوانی سے ڈر کیوں لگتا ہے۔" سلطان نے اُس کو ٹوک دیا۔

"وہی تو بتا رہا ہوں خان ـــ ارے خان پٹھان جیسے دل لرز گیا۔ سڑک پر مزے مزے چلا رہا تھا تانگہ، حرامی سڑے گھوڑی کے ٹھوتھن پر سپاٹا مارتا ہوا نکل گیا دھواں اُڑاتا۔"

"کون؟" سلطان نے سوال کیا۔

"ایک آٹو" جواب ملا۔ نگاہ پڑی تو اُس کی پیٹھ پر لکھا تھا ـــ "جے بھوانی" قسم قرآن کی ایسی طبیعت بگڑی کہ تانگہ اسی وقت گھر واپس لے گیا اور جانور کھول کر چھوڑ دیا۔"

"پھر میں تو شیواجی کی ایک تلوار کی بات کر رہا ہوں۔ اُس کا نام ہے بھوانی"

"ہوگی" سلطان کا ساتھی بڑا سا منھ بنا کر بولا۔

"ولایت میں ہے۔ انگریز لے گئے تھے" سلطان نے اطلاع دی اور بولا۔ "اس تلوار کو ولایت سے واپس مانگا جا رہا ہے۔"

"ہاں تو دے دیں گے وہ، اُن کے کس کام کی۔"

"اس تلوار میں کیا خاص بات تھی دادا۔ اسے واپس کیوں مانگا جا رہا ہے۔"

سلطان کے ساتھی کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ دوڑ گئی ـــ "تیری

مقصد میں گزارنے کے لیے مانگ رہے ہیں۔"
پھر اُس نے انگڑائی لی اور بولا "چلوں۔ جانور اُس بہت لے رہا ہے ان دنوں۔"

سلطان صبر و قناعت کی زندگی گزارنے والا ایک معمولی تانگے والا تھا۔ بچپن میں مڈل کے امتحان میں فیل ہوا۔ جوانی میں اکھاڑے میں ایک کشتی مارنے پر پہلوان کا لقب پایا۔ بچپن اور جوانی کے بیچ کسی دن بس چپکے سے اُس کے ہاتھ میں گھوڑے کی راس پکڑا دی گئی۔

سُلطان کے حافظے میں سب کچھ تر و تازہ تھا۔ ابھی کچھ ہی سال پہلے کی بات ہے جب شہر میں آٹو رکشا نہیں چلتے تھے۔ جب سڑکیں اتنی چوڑی نہ تھیں، جب گھاٹیاں اتنی اونچی نہ تھیں، جب فاصلے اتنے زیادہ نہ تھے۔ جب پیر اگڑھ میں نئے نئے ہی سندھی آئے تھے، جب پٹیاں ٹوٹی نہیں تھیں۔ جب خوف اتنا پاس نہیں تھا اور جب دوسرے اتنے دلیر بھی نہیں ہوئے تھے، جب بیالوگ اتنی گھٹیا سگریٹ نہیں پیا کرتے تھے اور جب سیٹھ ساہوکار خسارہ دکھانے کے لیے اور شریفوں کی پگڑی اُچھالنے کے لیے اُردو کا اخبار نہیں نکالا کرتے تھے۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ وہ اپنے گھوڑے کے سُموں پر مکھن ملتا تھا اور چاندرات میں دو سو روپے اپنے ہاتھوں سے خرچ کرتا تھا۔

سلطان شہر کے بہت سے سمجھدار اور شریف لوگوں کو جانتا تھا۔ ایک دن وہ ابراہیم پورہ سے گزرا تو مُحمّد میاں کی دکان پر اُسے شہر کے کچھ مہذب اور روشن فکر لوگوں کا جماؤ دکھائی دیا۔ سُلطان اُن میں سے اکثر چہروں کو پہچانتا

تھا پہونچا سلام کر کے ایک سے بولا۔
"میاں معاف کرنا ایک بات بتاؤ گے؟"
"ہاں ہاں" ۔۔۔ سلطان کو جواب ملا۔
"بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں یہ بھوانی کیا چیز ہے۔"
"بھوانی" ایک نے کہا۔
"بھوانی" دوسرے نے کہا۔
سلطان نے جن صاحب سے سوال کیا تھا اُنھوں نے سوال کو دوسرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"لو خان اُن کے سوال کا جواب دو۔ پوچھتے ہیں بھوانی کیا چیز ہے۔" ۔۔۔ ایک خوش فکر نے چٹکی لی "ارے خان بھوانی نہیں جانتے۔ یہ ایک طرح کی بیماری ہے، پیٹ میں اُتر جاتی ہے تو آدمی زیادہ کھانے لگتا ہے۔"
یہ سُن کر سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ سلطان وہاں سے کھسیانا ہو کر چل پڑا اور کچھ دور تک اس جرگے میں بیٹھے ہوئے کرخندار خاں، بابد خاں، شاعر خاں، بے روزگار خاں، صحافی خاں اور مدرس میاں کے چھوڑے ہوئے قہقہے سلطان کا پیچھا کرتے رہے۔
یہ بازار کے لوگ۔ کہ نہ تو یہ سفاک لوگ تھے، نہ چالاک لوگ تھے، نہ بے بس لوگ تھے، نہ تو انھیں بھولا ہی کہا جا سکتا تھا اور نہ موقع شناس تو پھر ان بازار کے سیدھے سادھے لوگوں میں یہ وصف کہاں سے پیدا ہو گیا تھا کہ جس بات کو جب چاہتے ہنسی میں اُڑا دیتے۔ یکایک سلطان کو لگا کہ اُنھوں نے اُس کی بے عزتی کی

ہے۔ وہ جھنجھلایا ہوا پلٹا اور اُن لوگوں کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہ لوگ خاموشی سے سلطان کی طرف دیکھنے لگے تو وہ اُداس ہوکر بولا۔

"آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں:" انھیں سلطان کا یہ سوال اچھا نہیں لگا لیکن چونکہ سلطان پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی اس لیے ایک نے کہا۔

"کیوں بھائی کیا اب ہنسیں بھی نہیں۔ ۔ ۔"

"پر میں نے تو بس ایک سوال ہی کیا تھا:"

سلطان کو سنجیدہ دیکھ کر ایک صاحب جن کے کان میں آہ لگا تھا قدرے سنجیدگی سے بولے۔

"بھائی سلطان تمھارے پاس تو ایک ہی سوال تھا؟"

"جی ہاں"

"لیکن ہمارے پاس سیکڑوں سوال ہیں۔"

"لیکن آپ لوگ ہنس کیوں رہے؟"

"ہنس اس لیے رہے سلطان بھائی کہ تمھارے سوال کا جواب تو ہم سے مل گیا لیکن ہمارے سوالوں کا تو کوئی اُلٹا سیدھا جواب بھی نہیں دیتا اور سلطان بھائی تم ہی انصاف کرو اگر انصاف تمھارے بس میں نہیں! انصاف کرو کہ جس کے سینہ میں سیکڑوں سوال ہوں اور اُس کو ایک سوال کا بھی جواب نہ ملے اور ہر پل، ہر گھڑی وہ زائد مادہ سوالات آپس میں صحبت کرکے ہزاروں کی تعداد میں بچے جنتے چلے جائیں اور سینہ پھٹنے لگے اور سانس رُکنے لگے اور دم گھٹنے لگے اور گھر بھی اچھا نہ لگے اور بیوی بچّے کاٹنے کو دوڑیں اور سفید پوشی

لازمی ہو اور گلاہ کو بھی رکھنا بھی ضروری ہو اور ہر دستر خوان کے ایک ایک لقمے کا حساب رکھتے رکھتے آنکھیں ڈبڈبا گئیں تو شلطان میاں آدمی کو ہر وقت ہنستے رہنا چاہیئے۔ جب کوئی سوال کرے تب بھی ہنس دینا چاہیئے اور اور جب کوئی جواب دے تب بھی ہنس دینا چاہیئے۔

یہ آدمی جو بہت بول رہا تھا بہت خاموش رہنے والا آدمی تھا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے اُنھوں نے محسوس کیا کہ اس آدمی کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے عینک کے پیچھے چمکتی ہوئی دو آنکھیں نم دیدہ ہو گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک نے اُس کو جلدی سے پانی پلایا اور اُس کی پیٹھ سہلانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

ٹیک اِٹ ایزی

ٹیک اِٹ ایزی۔

شلطان کھڑا اُس بہت زیادہ بولنے والے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی سلطان کی آنکھوں میں نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سیدھی بات یہ ہے کہ تم بھی خائف ہو اور سیدھی بات یہ ہے کہ خوف ہم کو بھی ہے اور سلطان بھائی اچھا یہ ہے کہ تمھارے پاس تمھارے خوف لفظ نہیں رکھتے اور بُرا یہ ہے کہ ہمارے پاس اس خوف کے لیے اتنے الفاظ موجود ہیں کہ ہم نے گھبرا کر ہنسنا شروع کر دیا ہے۔ تم بھولے اور نا سمجھ ہو اس لیے مارے جاؤ گے، ہم حرامزادے اور کمینے ہیں اس لیے مارے جائیں گے نجات دونوں طرف نہیں ہے۔ اس لیے سلطان بھائی جب بھی موقع ملے بھیجنے کے کباب کھاؤ، اپنی عورت کے ساتھ بڑا کام کرو، پھر ایک بیڑی جلاؤ اور ہنستے ہوئے

چلے جاؤ۔ تمہیں قسم ہے اپنے اکلوتے لڑکے کی اس کے علاوہ اگر کچھ کیا تم نے تو سمجھنا اپنی ماں کے ساتھ برا کام کیا تم نے ... سالے ... حرامی، ہم سے پوچھتا ہے کہ بھوانی کیا چیز ہے۔"

ٹیک اٹ ایزی

ٹیک اٹ ایزی

اُس روز سلطان بار بار جیسے چونک پڑتا۔ چوک میں سٹے کا نمبر لگاتے وقت اُس نے اپنی میلی سی قمیص میں جیب ہاتھ ڈالا تو ہر بار ایک روپے کے نوٹ کے بجائے کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا کوئی بلّہ یا الیکشن میں کھڑے ہونے والے کسی نمائندے کا پمفلٹ یا کسی اپیل کا پھٹا پرانا پرچہ نکلا۔ اُس نے سب کو خوب گالیاں دیں۔ پھر اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے کے دانے کے پیسوں میں سے سٹے کا نمبر لگایا۔ دو گرم گرم سموسے کھائے اور بدھوارے کے چوراہے پر پہنچ کر سولہ گٹی کھیلنے لگا کہ عشاء کی نماز کی اذان اُکمر دفون پر سنائی دی۔ اُسے جیسے جھٹکا سا لگا اور وہ بے چین بے چین سا چالیس چلنے لگا۔ آخر کو اُس سے نہیں رہا گیا تو وہ اپنے مقابل سے پوچھ بیٹھا۔

"بھائی میاں یہ بھوانی کیا چیز ہوتی ہے۔"

"بھوانی تو ہندو ہوتی ہے۔" اُس کے مقابل نے جواب دیا۔

"یہ تو اپن کو بھی پتہ ہے کہ یہ ایک دیوی کا نام ہے۔"

"عید کے روز میں مراد آباد میں تھا۔" اُس کا مقابل بولا۔ "وہاں میں نے راتوں میں کئی بار یہی نام سُنا تھا ___ ایسا لگتا تھا جیسے کلیجہ باہر آجائے گا۔ جیسے

بوڑھے بتاتے ہیں کہ ۷۱ء میں بھی ایسے نعرے کبھی نہیں لگے۔
"کیا کہتے تھے وہ لوگ؟" سلطان نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا جواب ملا۔

"وہ کہتے تھے بے بھوانی۔"
"کون خان؟ ایسا کیوں کہتے تھے؟"
"اس لیے کہ ہم ڈر جائیں، اور ہم ڈرتے تھے۔ قسم قرآن کی میاں حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو گئے۔ اللہ کی پناہ کیسی راتیں تھیں، کیسے دن تھے۔"
سلطان کی طبیعت اچٹ گئی۔ وہ بچے کھچے پیسوں سے گھوڑے کے لیے دانہ لے کر گھر چلا گیا۔

دوسرے روز جمعہ تھا اور سلطان زندگی میں شاید تیسری یا چوتھی بار جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد گیا۔ وہاں اُس نے وعظ میں کچھ اس طرح کی باتیں سنیں کہ انسان کو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے، کسی کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے۔ اور اپنے دل سے سارے خوف نکال دینا چاہیئے۔ نماز ختم ہونے پر اُس نے راستے میں ہی امام صاحب کو جا لیا اور اُن سے بولا۔
"میاں میں کیا کروں؟"
"کیا بات ہے؟"
"پتہ نہیں پر بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں بس ایک ڈر سا لگا رہتا ہے ہر وخت۔"
"کیا کام کرتے ہو؟"

"تانگہ چلاتا ہوں۔"

"کتنے بچے ہیں؟"

"بس ایک لڑکا ہے۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"سلطان۔"

"ماشاء اللہ۔ کتنا اچھا نام ہے تمھارا۔ جس کا نام سلطان ہو وہ کبھی ڈر سکتا ہے بھلا۔ تم اپنے گلے میں علی شیرِ خدا کا نام ہر وقت پہنے رہا کرو۔ سارے ڈر ختم ہو جائیں گے۔ وہ تم کو ہر آفت سے بچائیں گے۔" یہ کہہ کر امام صاحب آگے بڑھ گئے۔

سلطان نے بعد میں پتہ لگایا کہ یہ نام کہاں ملے گا تو اُس کو معلوم ہوا کہ جمعراتی بازار میں پھول متی نام کی ایک بیوہ کی چھوٹی سی طغروں کی دکان ہے وہاں یہ نام مل جائے گا۔ ایک دن سلطان اتفاق سے پھول متی کی دکان کے سامنے سے گزرا تو ٹھہر گیا۔ بوڑھی بیوہ کسی گاہک سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"حاجی صاحب: مجھ بیوہ کو اور تھوڑی کاٹنی ہے۔ تم سب کا ہی سہارا ہے۔ دکان کا کرایہ پائی پائی ادا کر دوں گی۔ چار دن کا سمے اور دے دو۔"

سلطان نے سوچا پھر موقع ملے یا نہ ملے طغرہ لیتا ہی چلے۔ یہ سوچ کر وہ پھول متی کی دکان پر گیا۔ دکان پر اُس وقت پھول متی کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ننگے سینے کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر کرچن تھی۔ وہ بار بار دمے کے مریض کی طرح سانس لے رہا تھا۔ یکایک سلطان کی نظر لڑکے

کے گلے میں لٹکی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔ اُس نے غور سے دیکھا وہ ایک طغرہ تھا جس پر خوبصورت حروف میں لکھا تھا۔ "جے بجرانی"۔ سلطان نے وہاں طرح طرح کے طغرے دیکھے۔ سب میں ایک ہی طرح کی کاریگری تھی، ایک ہی طرح کا مال تھا۔ "یاعلی" سلطان کی نظر یکایک ایک طغرے پر پڑی جسے سلطان نے آنکھوں سے لگا کر خرید لیا۔

رات اپنے بستر پر سلطان طغرے کی ڈوری کے سرے پکڑے، اُسے کچھ دیر دیکھتا رہا اور چاہتا تھا کہ اُسے اپنے گلے میں پہن لے کہ اُس کی نظر اپنے بڑے لڑکے پر پڑی جو پاس ہی زمین پر ایک پھٹی دری بچھائے سو رہا تھا۔ سلطان چپکے سے اپنی چارپائی سے اُٹھا اور اُس نے وہ طغرا اپنے بچے کے گلے میں باندھ دیا۔ اور اس پیار سے اپنے بچے کو دیکھنے لگا جیسے اُس نے دوسری بار اپنے باپ ہونے کا حق ادا کیا ہو۔ پہلی بار اُس کو یہ احساس تب ہوا تھا جب اُس نے بچے کی نازک ہتھیلیوں میں اوّل اوّل گھوڑے کی لگام تھمائی تھی۔

■

آخری پتّہ

ایک طوطا تھا ——
ایک مینا تھی ——
طوطا ویسا ہی تھا جیسے طوطے ہوتے ہیں — مینا بھی ویسی ہی تھی ——
بھولی بھالی۔
اسی طرح ایک بہت بڑا جنگل تھا اور اُس جنگل میں ایک درخت، خوب گھنا سا، ہرا بھرا، سایہ دار، بھاری بھرکم درخت، طوطا اور مینا تھا دونوں دن ڈھلے اُس درخت پر آ کر بسیرا کرتے۔ ——————
—— : طوطا اور مینا نے اتنے بڑے جنگل میں بسیرے کے لیے یہ درخت یوں ہی نہیں پا لیا تھا۔ طوطے کو یاد تھا کہ جب پہلی بار اُس کے بازوؤں میں اُڑنے کی طاقت پیدا ہو گئی تھی اور وہ جنگل کے ایک درخت پر بسیرے کے لیے جا کر بیٹھا تھا تو اُس کو اُس درخت کے جانوروں نے کتنا ستایا تھا۔ اور پھر کتنی ہی راتیں اُس طوطے اور مینا نے اپنی حفاظت کے لیے ایک درخت سے دوسرے درخت

پر پناہ لینے میں گزار دی تھیں۔ وہ جس درخت پر جاتے وہاں کے مکین انھیں ٹکنے نہ دیتے۔ آخر کو وہ ٹُنڈ مُنڈ درخت کی شاخ پر جا بیٹھے تھے۔

ایک دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ طوطے نے دیکھا اُس ٹُنڈ مُنڈ درخت کی شاخ کے سرے پر ایک ہری ہری پتّی سی جھانک رہی تھی۔ طوطے نے یہ خبر مینا کو سُنائی۔ مینا مارے خوشی کے دیوانی ہو گئی۔ پھر تو دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت پر اَن گِنت پتیاں نکل آئیں اور ایک دن وہ خوب گھنا سا ہرا بھرا سائے دار درخت بن گیا اور وہ دونوں اُس کے سائے میں آرام کرنے لگے۔

ایک دن مینا نے طوطے سے کہا کہ وہ درخت کی پتّیوں کو ذرا غور سے دیکھے کیوں کہ وہ پتّیاں دوسرے درختوں کی پتیوں سے زیادہ تازہ' زیادہ نرم و نازک اور زیادہ سرسبز و شاداب تھیں۔ یہ سُن کر طوطے نے پتیوں کو غور سے دیکھا تو حیرت سے اُس کی آنکھیں واقعی کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ پتیاں انتہائی اُجلی' ملائم اور ہری بھری تھیں بلکہ اُن پر عجیب طرح کی عبارتیں لکھی تھیں۔ اُن عبارتوں کو دیکھ کر طوطا بہت پریشان ہوا۔

"کیا تم اس عبارت کو پڑھ سکتے ہو؟"

مینا نے جب کئی بار اس سوال کو دہرایا تو اس غریب طوطے کو اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔ مینا کو یہ جان کر افسوس ہوا اور اُس دن سے وہ برابر طوطے کو شرم دلاتی رہی کہ جس درخت پر وہ رہتا ہے اُس کے پتّوں میں اللہ نے اس قدر علم عطا کیا ہے اور وہ طوطا ہوتے ہوئے بھی اُس علم سے نابلد ہے

آخر کو ایک دن اُس طوطے کو بڑی شرم آئی۔ اور وہ اُس جنگل میں ایک

ایسے عالم کی تلاش میں نکلا جو اسے اُن پتوں میں چھپے علم کے خزانے سے مالا مال کر سکے۔ تب ہی طوطے کی ملاقات خوش قسمتی سے ایک گدھ سے ہوئی جو نہ جانے کتنے برسوں سے اس جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کی زبانوں سے واقف تھا۔ طوطا گدھ کو لے کر اپنے ٹھکانے پر آیا اور گدھ کو وہ پتیاں دکھائیں۔ گدھ بڑا خرّانٹ تھا" اس نے عبارت کو پڑھا اور وہ علم طوطے کو رٹا کر اڑ گیا۔ اب طوطا اُس درخت کی ایک ایک پتی کی عبارت کسے واقف ہو چکا تھا۔

پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اُس جنگل سے جو بھی قافلہ گزرتا، کچھ دیر کے لیے اُس گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے دم لیتا کہ وہ درخت باقی تمام درختوں سے بہت بڑا، بہت گھنا اور بہت سایہ دار تھا۔ اُس کے سائے میں بیٹھ کر چند لمحے لوگ اپنے اپنے دُکھ درد ایک دوسرے سے بیان کرتے، کیوں کہ طوطا انسانوں کی زبان سے خوب واقف ہو چکا تھا اس لیے وہ اُن کی دُکھ بھری داستانیں سُنتا، سمجھتا اور اُن پر افسوس کرتا۔

ایک دن مینا نے طوطے سے کہا۔

"کیسے کیسے لوگ ادھر سے گزرتے ہیں، دو پل ہمارے درخت کے سائے میں بیٹھ کر اپنے اپنے دکھ درد بیان کرتے ہیں۔ کیا ہم اُن کے لیے کچھ نہیں کر سکتے ؟"

طوطے نے کہا ۔۔۔ "ہم معمولی پرندے بھلا انسانوں کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔"

تب ہی مینا نے طوطے کو یاد دلایا۔

"آخر ہے تم طوطے کے طوطے ہی، ارے اتنا ڈھیر سارا علم تم نے اُن

پتوں سے پایا ہے۔ کیا تم اس علم کے ذریعے ان دکھیوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ہو؟"

طوطے نے جواب دیا "بات تو تم ٹھیک کہتی ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ اس علم کو ان لوگوں تک کیسے پہنچاؤں۔ وہ میری بولی نہیں جانتے۔"

"اچھا تو ایک کام کرو۔" مینا نے طوطے کو مشورہ دیا ۔ "تم اپنی نوکیلی چونچ سے ایسی پتّی توڑ کر گرا سکتے ہو جس کے علم سے ان غریبوں کی مشکلیں آسان ہو جائیں۔"

طوطا یہ سن کر بہت خوش ہوا اور مینا کی عقل پر آفرین بھیجتے ہوئے بولا۔ "یہ تم نے بڑی اچھی صلاح دی ۔ ہم آیندہ سے اس علم کو ضرور تقسیم کریں گے تاکہ اس راہ سے گزرنے والے اپنے دُکھوں کو کم کر سکیں۔ آج سے ہم اس شجر سے ہر ایک راہی کو علم بانٹیں گے جس کو اس کی ضرورت ہو گی۔"

پھر اُس دن سے یہ ہوا کہ جب کوئی راہ رو یا قافلہ یا کوئی دُکھیارا اس درخت کے نیچے آ کر بیٹھتا اور اپنے درد و غم کا احوال سُناتا تو طوطا بڑے غور سے اُس کی دُکھ بھری کہانی سُنتا اور پھر درخت کی ایک ایک پتّی پر لکھی عبارت کو غور سے پڑھتا یہاں تک کہ جب اُس کو ایسی پتّی مل جاتی جس پر لکھے ہوئے علم سے اس دکھیارے کا غم دُور ہو سکے تو اپنی چونچ سے اُس پتّی کو توڑ کر نیچے گرا دیتا۔ پتّی راہ رو کی گود میں گرتی اور وہ دکھیارا اُس پتّی کے گیان سے اپنے درد و غم کی راہِ نجات پا کر اور تازہ دم ہو کر امید کی نئی روشنی کے ساتھ پھر سے اپنے سفر پر چل پڑتا۔ نہ جانے کتنے نامراد اس درخت کے نیچے بیٹھے اور علم کے اس تجربے

اپنی مرادیں اور اپنے درد کا درماں لے کر گئے۔

لیکن افسوس جو پتی ٹوٹتی پھر اُس کی جگہ نئی پتی نہ اُگتی۔ دھیرے دھیرے درخت کا سایہ بے بساط ہو کر رہ گیا۔ ایک دن مینا نے طوطے سے کہا۔

یہی حال رہا تو ہمارے ہی ہاتھوں سے ہمارا آشیانہ اُجڑ جائے گا کیوں کر نئی پتیاں اُگنا بند ہو چکی ہیں۔ طوطا یہ سُن کر فکر مند ہو گیا۔ کئی بار اُس کے جی میں آئی کہ علم کے برگ سبز دوسروں کو تقسیم کرنا بند کر دے لیکن طوطا ایسا نہ کر سکا۔ مسافروں کی آہ و فریاد پر اُس کا دل پسیج جاتا۔ کیوں کہ مسافروں میں اب وہ درخت بہت مقبول ہو چکا تھا۔

بہت زمانہ گزر گیا۔ ایک دن طوطے نے ایک بوڑھے کو دیکھا جس کی ریش سفید، بھویں سفید اور کمر جھکی ہوئی تھی۔ مینا کی جب اُس پر نظر پڑی تو اُس کو لگا جیسے وہ پہلے بھی اُسے دیکھ چکی ہے۔ اُس بوڑھے کے ساتھ اُس کا جوان بیٹا اور جوان بیٹے کا بیٹا بھی تھا۔ وہ جب درخت کے نیچے اپنے کنبے کو لے کر بیٹھا کو ساعت کو اُس نے سُنا کہ بوڑھے کا پوتا اپنی نئی نویلی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

"یہ بڈھا کسی طرح مرتا نہیں۔ آخر کب ہم اتنی بڑی جائداد کے مالک بنیں گے اور اپنی من مانی کر سکیں گے۔"

طوطے کو لگا کہ اس سے پہلے بھی وہ ایسی آواز اور جملے کہیں سُن چکا ہے۔ کیوں کہ طوطے کو اور کسی بات پر یقین چاہے نہ ہو لیکن اپنے حافظے پر پورا یقین تھا اس لیے ان لوگوں کی ساری باتیں اُس نے غور سے سُنیں اور تب اُس پر یہ راز کھُلا کہ یہ خاندان اس سے پہلے بھی اس درخت کے نیچے ٹھہر چکا ہے اور

تب وہ بوڑھا جس کی کمر آ جھکی ہے اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ آیا اور باپ کے مرنے کی اسی طرح راہ دیکھ رہا تھا۔ اس دن طوطے پر یہ انکشاف ہوا کہ اس جنگل کے مسافر، راہ رو اور وہ سارے قافلے جو اس درخت کے نیچے ٹھہر کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دراصل کسی ایسی راہ کے مسافر ہیں جو گھوم پھر کر پھر اسی درخت کے نیچے سے گزرتی ہے۔

طوطے نے حسرت سے درخت کی شاخوں کی طرف دیکھا۔ اب درخت کی سب ہی شاخیں خالی ہو چکی تھیں بس صرف پھنگی پر چند پتیاں رہ گئی تھیں وقت گزرتا گیا آخر کو اس درخت پر صرف ایک ہی پتی رہ گئی۔

تب ہی خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن طوطا مینا جب گھوم پھر کر اپنے ٹنڈ منڈ درخت پہ آ کر بیٹھے تو انھوں نے دیکھا درخت کے پاس ہی کچھ لڑکے بیٹھے تھے۔ ان نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر طوطا ٹھٹھکا۔ بہت دنوں بعد اُس درخت کے قریب کچھ نقل و حرکت دکھائی دی تھی طوطے نے دیکھا لڑکوں کے چہرے پر اُداسی تھی اور آنکھوں میں فکر مندی جیسے سارا دن انھوں نے ٹھوکریں کھائی ہوں۔ ابھی طوطا ٹھیک سے اُن کا جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ ان میں سے ایک بولا۔

"دیکھو یارو ہم نے کتنی کوشش کی، کس قدر چلائے اور کتنا زور لگایا لیکن بخت نے یاوری نہ کی اور گوہر مراد حاصل نہ ہو سکا۔"

"کیوں نہ ہم ایک بار پھر کوشش کر دیکھیں یقین محکم، عمل پیہم وغیرہ کے بارے میں سنا ہے کہ بڑے کام کی چیزیں ہیں۔"

یہ بات اُس نے کہی جو شائد اُن سب کا لیڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہ سُن کر باقی سب پھر کھڑے ہو گئے۔ اور پھر ان سب نے مل کر آواز سے آواز ملا کر بلند آواز میں دہرایا۔

انقلاب زندہ باد۔

انقلاب زندہ باد۔

کئی بار انھوں نے ان لفظوں کو دہرایا اور ہوا میں ہاتھ بھی اُچھالے جب کئی بار وہ ایسا کر چکے تو اُن میں سے ایک نے اعلان کیا کہ سب پسینہ پسینہ ہو چکے ہو چکے ہیں اور جتنی محنت واجب الادا تھی ہو چکی ہے بس انجام پر نظر کی جائے کہ شائد اب گوہر مُراد میسّر ہو۔

چنانچہ ہر ایک نے باری باری اپنی ٹانگوں کے نیچے جھانک کر دیکھا اور اپنے لیڈر کو بتایا کیونکہ اُنھوں نے کبھی انقلاب کو دیکھا نہیں ہے اس لیے وہ وثوق سے بتا نہیں سکے کہ انقلاب برآیا نہیں لہٰذا اُن کے لیڈر نے جب اپنی ٹانگوں کے نیچے جھانک کر دیکھا اور بتایا کہ انقلاب ابھی نہیں ہوا ہے اور اُن کے بلند و بانگ نعرے بے ثمر قرار پائے ہیں تو ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار صاف نظر آنے لگے۔

تب ہی سیدھی سادی مینا نے طوطے سے سوال کیا۔

"بھائی طوطے یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ طوطا جو بڑی ہمدردی سا تھ اُن کو دیکھنے میں منہمک تھا بولا۔

"بی مینا یہ جوان انقلاب کرنے نکلے ہیں۔ دن بھر انقلاب کرنے کی کوشش

میں انھیں شام ہو گئی تو دم مارنے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ رات سروں پر آ جائے انھوں نے ایک دفعہ پھر انقلاب لانے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ انقلاب نہیں ہوا۔"

"بیچارے" مینا نے کہا۔ "طوطے بھائی اگر انقلاب نہیں ہوا تو کیا اُن کو بہت افسوس ہوگا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے" طوطے نے جواب دیا۔

"تب تو ہمیں اُن کی مدد کرنا چاہیئے" مینا بولی۔

طوطے نے سر اُٹھا کر درخت کی پھننگی پر لگی اُس آخری پتی کی طرف دیکھا اور اُداس ہو گیا۔ اُس درخت پر وہ ہریالی کا آخری نشان تھی۔

وہ لڑکے اب پھر کھڑے ہو چکے تھے اور اس بار زیادہ زور شور سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ قصہ کوتاہ وہ نعرے لگاتے لگاتے ہانپنے لگے اور ایسا لگا جیسے بے دم ہو جائیں گے تو اُن کے لیڈر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں غور سے دیکھنا چاہیئے اس بار انقلاب ضرور ہو گیا ہوگا۔"

لیکن تھوڑی دیر بعد وہ سب مایوسی سے نفی میں سر ہلا کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر مینا کے دل میں بہت رحم آیا اور طوطے سے بولی۔

"کچھ تو شرم کرو" تم سے ان نوجوانوں کی بے بسی کیسے دیکھی جا رہی ہے؟"

طوطے نے کہا۔ "بی مینا وہ آخری پتہ جو اب ہمارے درخت پر لگا ہے پتہ نہیں اُن کے کام آسکے گا؟"

"اُس پر کیا لکھا ہے؟" مینا نے اٹھلا کر پوچھا۔

طوطے نے اُسے بتایا۔

"اس پر لکھا ہے، اے دنیا کے انقلاب پسندو، انقلاب نام ہے حوصلے اور قربانی، سرفروشی اور جانبازی کا اور انقلاب کی کبھی نہ ختم ہونے والی نے کے لیے تمہیں جن جانبازوں کی ضرورت ہے اُن میں سے بھگت سنگھ بھی ایک ہے۔"

مینا نے تڑپ کر کہا ارے یہ پتہ تو اُن لوگوں کے کام کا لگتا ہے۔"

طوطا اُداسی سے بولا ۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ مجھے آج ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیسا ڈر؟"

"میرا دل نہیں چاہتا کہ میں اس پتے کو اپنے درخت سے جُدا کروں۔"

مینا نے اُسے ڈھارس دی۔

"ارے کیوں فکر کرتے ہو۔ جب آشیانے کی ساری ہریالی مٹا چکے تو پھر اس ایک پتے کا موہ کیوں کرتے ہو۔ پھینک دو کتر کر نوجوانوں کی جھولی میں۔"

طوطا آہ سرد بھر کر بولا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے۔ کوئی اندر سے بار بار کہتا ہے۔ دیکھو طوطے ایسا

نہ کرنا۔ بہت بُرا ہوگا۔ تو ضد کرتی ہے تو ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر طوطے نے وہ آخری پتّہ اپنی چونچ سے کتر کر نیچے نوجوانوں کی طرف پھینک دیا۔ ایک نوجوان نے پتّے کی عبارت پڑھی اور خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے بولا۔
"آسمانی طاقتوں نے ہمیں انقلاب سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب ہماری منزل دُور نہیں ہے۔ آؤ ہم سب مل کر بھگت سنگھ کو تلاش کریں۔
یہ سُننا تھا کہ باقی لوگوں نے چاروں طرف اپنے منھ کر کے بھگت سنگھ کو زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پورب کی سمت سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ اکہرے بدن کے اس آدمی کے سر پر جوڑا بندھا تھا۔ چہرے پر مونچھیں تھیں اور وہ قمیص اور نیکر پہنے ہوئے تھا وہ آواز لگانے والوں کے پاس آکر بولا۔

"کیا بات ہے ــــ کیوں چلّا رہے ہو؟"
"بھیّا۔ بھگت سنگھ کیا تم ہی ہو۔" ایک نوجوان نے سوال کیا۔
"ہاں"۔ آنے والے نے جواب دیا۔
"کیا تم نے ہی اسمبلی میں بم پھینکا تھا؟" ــــ دوسرے نے سوال کیا۔
"ہاں میں نے ہی بم پھینکا تھا۔"
"کیا تم کو ہی پھانسی ہوئی تھی"۔ تیسرے نے سوال کیا۔
"ہاں بھیّا بولو کیا بات ہے"۔ آنے والے نے متانت سے جواب دیا۔
"تو کیا تم وہی بھگت سنگھ ہو جس نے انقلاب کیا تھا؟"
"ہاں میں وہی بھگت سنگھ ہوں لیکن تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"بیٹا بھگت سنگھ ہمیں ایک بار اور انقلاب کر دو۔ ہم تمھارے بہت شکرگزار رہیں گے۔"

وہ چاروں اُن کے قدموں میں لوٹ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک گڑگڑایا۔
"جب تک آپ انقلاب کرنے کا وعدہ نہیں کریں گے ہم آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔" بھگت سنگھ یہ سُن کر سٹپٹایا اور بولا۔
"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"ہو سکتا ہے نہیں بلکہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں انقلاب کی بہت ضرورت ہے، ہم آپ کے ہاتھ جوڑتے ہیں۔"
"بس ایک بار انقلاب کر دیجیے۔ پھر وہ ایسے گڑگڑانے لگے جیسے جنم جنم کے فقیر ہوں۔
بھگت سنگھ کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ فکرمندی کے ساتھ بولا۔
لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تو ٹرک چلانے کا پرمٹ ہے۔ دن رات ٹرک چلاتا ہوں۔ سڑک کے کنارے کسی ڈھابے میں سنترے کی بوتل کے ساتھ تندوری روٹی اور بھنا گوشت کھا کر دو گھنٹے چارپائی پر کلینر کے ساتھ آرام کرتا ہوں اور پھر ٹرک لے کر آگے چل پڑتا ہوں۔ میں ایک جگہ جم کر رہتا ہی کہاں ہوں جو مجھے انقلاب کرنے کی فرصت ملے۔ بھگت سنگھ نے سوچا تھا کہ وہ ٹکا سا جواب دے کر بات کہہ دینے سے گلو خلاصی ہو جائے گی۔ مگر وہ لڑکے اپنی ہمت پر قائم تھے۔ اُن کا سردار بولا۔

"دیکھیے بھائی بھگت سنگھ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ انقلاب کی بہت سخت ضرورت ہے۔ فوراً اور ابھی آپ بس ایک بار بم چھوڑ دیجیے۔ بس ایک بار!"

"بم چھوڑ دوں" — بھگت سنگھ جیسے اچھل پڑے۔ "ارے بھائی کیوں مجھ غریب کو پھانستے ہو۔ ابھی دو سال ہوئے ہیں تو شادی کی ہے۔ سال بھر کی بچی ہے میری — غریب ہوں، چار پیسے کما کر لاتا ہوں تو بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں۔"

"دیکھیے۔ ایک بار اور پھانسی پر چڑھ جائیے۔" دوسرے نے منت کی۔
پھانسی پر چڑھنے کی بات سن کر ایک بار بھگت سنگھ کی آنکھوں میں گزرے دنوں کی پرچھائیاں دوڑ گئیں۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
"کیوں یاد دلاتے ہو اس زمانے کی، اب پھانسی پر چڑھنے کی نوبت مشکل سے ہی آتی ہے۔ اگر میں اقبالی گواہ بن گیا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"
"تو تم انقلاب نہیں کرو گے؟" اُن میں سے ایک بولا۔
"نہیں" بھگت سنگھ نے جواب دیا۔
اُن میں سے ایک بھگت سنگھ کے پاس آیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بولا۔

"سچ بات یہ ہے کہ ہم بہت دنوں سے انقلاب کی تلاش میں مارے مارے گھوم رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے باس کا کہنا ہے کہ اگر انقلاب کو تلاش کر کے نہیں لائے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہت بار انقلاب کے نام

پرہم اپنے پاس سے ایڈوانس بھی دے کر رکھا چکے ہیں۔ تم کو کچھ نہیں کرنا ہے صرف ہمارا باس جہاں کہے وہاں دو چار بم پھینک دینا ہے۔ باقی کام ہم سب مل کر کر لیں گے۔ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں گئے تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

"نہیں بھائی میں مجبور ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔" ——— بھگت سنگھ نے احتجاج کیا۔

تب تو خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ان لڑکوں کے لیڈر کو غصہ آ گیا۔

اس بار وہ ذرا سخت آواز میں بولا۔

دیکھو بھگت سنگھ بات کو آگے مت بڑھاؤ ——— ہمارا باس تم سے انقلاب کروا کر رہے گا۔ سودا چاہو تو اسی جگہ کر لو ——— بولو پانچ ہزار منظور ہے۔ صرف ایک بم پھینکنے کے پانچ ہزار روپیے۔"

اُن سب نے اب بھگت سنگھ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ بھگت سنگھ کو اپنے چاروں طرف بڑھتے ہوئے خطرے کی بو محسوس ہوئی اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلانے لگا۔ "بچاؤ بچاؤ!"

ابھی اس کی چیخیں نکلی ہی تھیں کہ اُن میں سے ایک نوجوان نے بڑھ کر اس کی چھاتی پر چمکتے ہوئے چاقو کی نوک رکھ دی۔

"ہاتھ آئے بھگت سنگھ کو ہم ایسے نہیں جانے دیں گے۔"

"مجھے چھوڑ دو" ——— بھگت سنگھ گڑگڑایا۔ "رحم کرو مجھ پر۔"

"رحم کرنے والے انقلاب نہیں کر سکتے۔" ——— چاقو والے نے جواب دیا۔

چاقو کی نوک بھگت سنگھ کو چبھنے لگی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھگت سنگھ

کا پنجابی خون گرما اٹھا۔ فرار کی کوئی راہ نہ پا کر اس نے اپنی کمر سے بندھی چمڑے کی پیٹی کھول لی اور اُن چاروں پر پل پڑا۔ وہ چار تھے اور بھگت سنگھ اکیلا لیکن بہرحال وہ بھگت سنگھ تھا۔ بہت دیر تک مقابلہ کرتا رہا۔ قصہ کوتاہ بھگت سنگھ مقابلہ کرتے کرتے جب تھک گیا تو ان چاروں نے اُس کو اس ٹنڈ منڈ درخت کے تنے کے قریب پٹک دیا۔ پھر اُن کا لیڈر ہاتھ میں چاقو لے کر بھگت سنگھ کے سینے پر سوار ہو گیا اور بولا۔

"کیوں بے ٹرک ڈرائیور اپنے کو سچ مچ بھگت سنگھ سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ دن سات ہزار منتظر ہیں۔"

بھگت سنگھ نے جلتی ہوئی آنکھوں سے چھاتی پر چڑھے ہوئے آدمی کو غور سے دیکھا اور پھر اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ لیڈر چلایا۔ "گلا کاٹ دو حرامزادے کا۔" اور انھوں نے بھگت سنگھ کا گلا کاٹ دیا۔ ٹنڈ منڈ درخت کی سب سے آخری شاخ پر ایک طوطا تھا اور ایک مینا۔

ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے چند لوگ تھے اور ایک لاش۔

زمین پر ایک درخت تھا بے برگ اور بے ثمر۔

جیسے بھگت سنگھ کے دن پھرے خدا کرے سب کے دن پھریں۔ "رہے نام ...

شرمندگی

پورے یقین کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اُس آدمی سے ملنے کی خواہش ہے۔

وہ آدمی — بہت دنوں سے میں نے اُس کو نہیں دیکھا تھا۔

بہت دنوں سے اس ملاقات کی خواہش کچھ شدید ہو گئی تھی۔

یعنی ایسا ہوتا تھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اُس آدمی کا خیال میرے ذہن میں آنے لگا تھا۔

وہ آدمی کہاں ملے گا؟'

یعنی ٹھیک اُس وقت جب میں اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا' وہ کہاں ہو گا۔

سڑک پر ایک طرف سے لوگ آتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری سمت جاتے ہوئے۔

وہ آدمی آنے والوں میں بھی ہو سکتا ہے اور جانے والوں میں بھی۔

لیکن یہ کون جان سکتا ہے کہ وہ سڑک پر چل ہی رہا ہوگا۔ کیا پتہ وہ کسی چہار دیواری کے اندر ہو۔ کسی ہوٹل میں، شراب خانے میں، اسپتال کے وارڈز میں، ٹرین یا ہوائی جہاز میں، وہ کہیں بھی اور کسی بھی حال میں ہو سکتا تھا۔

بہت بار ایسا ہوا کہ وہ آدمی میرے ذہن سے اُتر گیا۔

دراصل وہ لمحات جب وہ میرے ذہن سے خارج تھا میرے حساب کتاب میں شامل نہیں۔

اس لیے میں بھی صرف اُس وقت کی ہی بات کر رہا ہوں جب وہ مجھے اس قدر شدّت کے ساتھ یاد آیا کہ میں اُس سے ملنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا تھا۔

کوئی آدمی کسی کو کیوں یاد آتا ہے یا یاد آتا رہتا ہے؟

اس بات کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی نہ کوئی شخصیت ایسی آتی ہے جسے وہ بہت بار یاد کرتا ہے اور اُس سے ملنے کی خواہش بھی رکھتا ہے۔

اکثر راہ چلتے مجھے لگتا کہ وہ آدمی میرے بغل سے گزر گیا ہے۔

کبھی کسی پان والے کی دکان پر کھڑے ہوئے لوگوں میں مجھے ایسا لگا جیسے وہ بھی کھڑا ہے۔

بس اسٹاپ پر انتظار کرنے والے لوگوں میں اُس کا جیسا حلیہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے وہ بھی کھڑا ہے۔

ممکن ہے وہ آدمی بھی مجھے کبھی اسی طرح شدّت سے یاد کرتا رہا ہو اور اُسے بھی دوسروں پر میرا گمان ہوتا ہو۔

اُس آدمی سے ملاقات کی آرزو مجھے کیوں تھی ؟

بہر حال یہ بات تو طے ہے کہ اس خواہش کے پیچھے نہ کوئی تجارتی مقصد تھا اور نہ کوئی مالی غرض۔ کسی بھی طرح کے کاروباری جذبے کو اس خواہش میں دخل نہیں تھا۔ اس بات کو میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

بات کو اُلجھائے بغیر میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے مکان سے بھی واقف تھے۔

ملاقات کی ان خواہشوں کے درمیان دو ایک بار ایسا ہوا کہ میں وقت نکال کر اُس سے ملنے کے لیے اُس کے گھر بھی گیا۔

تمام لوگ گھروں پر کس وقت ہوتے ہیں اور کس وقت نہیں ہوتے اس بارے میں اگرچہ بہت زیادہ اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن یہ سچ ہے کہ دونوں بار اچھی خاصی مسافت طے کرنے کے بعد جب میں اُس کے گھر گیا تو وہ مجھے گھر پر نہیں ملا۔ بال بچوں والا آدمی ہوتے ہوئے بھی وہ صبح سویرے گھر پر نہیں تھا۔ رات گئے بھی گھر پر نہیں تھا۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ میری اُس آدمی سے ملاقات کی شدید خواہش کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی تو یہ بے انصافی ہوگی۔ کیوں کہ آدمی کے مطالبات اور اُس کی آرزوؤں میں یک رنگاپن کہاں ہوتا ہے۔ ہم سب کیا سب سے ایک جیسی

وعدات اور مطالبات کے ساتھ ملتے ہیں؟

چند دنوں بعد جب وہ مجھے پھر یاد آیا تو میں نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی ایک سیدھی سی ترکیب نکالی۔

اُسے ایک پوسٹ کارڈ لکھا۔

اُس کا جواب آیا کہ اُس کو میرا خط پا کر خوشی ہوئی اور وہ خود بھی مجھ سے ملنا چاہتا ہے اور وہ فی الحال شہر سے باہر جا رہا ہے، واپسی پر وہ مجھ سے ضرور ملے گا۔

اس خط و کتابت کے بعد بہت دنوں کے لیے وہ پھر میرے ذہن سے کہیں غائب ہو گیا۔

ایک دن جب مجھے پھر لگا کہ مجھے اُس سے ملنا چاہیے تو میں نے اُسے ایک پوسٹ کارڈ پر یہ لکھ کر ڈال دیا کہ میں فلاں تاریخ کو فلاں بجے فلاں ریسٹورنٹ میں فلاں میز پر اُس کا انتظار کروں گا۔

تاریخ آئی۔

وہ وعدے کے مطابق میں ہوٹل میں پہنچا۔

افسوس اپنے ہی دیے وقت کے مطابق مجھے آدھے گھنٹے کی دیر ہو چکی تھی۔

بیرے نے بتایا کہ اُس حلیے کے ایک صاحب میز پر بیٹھے تھے پندرہ منٹ بعد چلے گئے۔

جنھیں میری اس خواہش پر حیرت ہو سکتی ہے اُن کے لیے میں اتنا ہی عرض

کر سکتا ہوں کہ اُس آدمی سے میری ملاقات پہلی بار کچھ واجبی سی ہی ہوئی تھی۔
ہم شناسائی کی اُس منزل میں نہ تھے کہ جس تعلق کو دوستی کا نام دیا جا سکتا
ہے بس تھوڑی سی میل ملت ہی کہی جا سکتی ہے جو ہمارے درمیان قائم
ہوئی تھی۔ فی الحال اتنا ہی کہہ سکتا تھا کہ مجھے اس آدمی کے قریب آنا چاہیئے۔

فی الحال اتنا ہی درست ہوگا۔

یہ بھی درست ہوگا کہ مجھے اُس شخصیت کے کسی پہلو میں اتنی جاذبیت نظر
آئی جو مجھے اُس کی یاد دلاتی تھی اور اندر سے یہ جی چاہتا تھا کہ میری اُس کی
ملاقات ہو۔

تجدیدِ ملاقات سے کسی تسکین کا مبہم نہ سہی تو غیر واضح احساس تو ضرور ہی
موجود تھا مجھ میں۔

ایک بار جب میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا تو میں نے اُسے
ایک ایسی بھری بس میں کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا جو
اسٹاپ پر رُکے بغیر نکلی چلی گئی۔ مجھے اچانک اُس کے نظر
آنے پر بڑی خوشی ہوتی تھی اور اُس مسرت کے جوش میں
میں نے اُس کو یکایک دو ایک بار زور سے آواز بھی دی۔
ممکن ہے اُس نے میری آواز سُنی ہو یا نہ سُنی ہو۔ میں نے
ہاتھ ہلا کر اُسے اپنی طرف مخاطب بھی کیا تھا۔ مجھے اپنی اس
حرکت پہ بعد میں کچھ شرمندگی بھی ہوتی تھی۔ اگر وہ اس
حالت میں مجھے دیکھ بھی لیتا یا میری آواز سُن بھی لیتا تو وہ

اُس کھڑکی سے پھاند تو پڑتا نہیں۔

ایک دن شام کو میں دفتر سے گھر معمول سے کچھ زیادہ تاخیر کے ساتھ پہنچا ــــ قدم رکھتے ہی مجھ سے معلوم کیا گیا کہ کیا راستے میں میری اُن صاحب سے ملاقات ہو گئی جو اسی وقت میرے بارے میں دریافت کر کے واپس ہوئے تھے۔ میرے نفی میں جواب دینے پر مجھے بتایا گیا کہ ایک صاحب بس دو ہی منٹ پہلے مجھے دریافت کر کے لوٹ گئے ہیں اور انھیں واپس گئے اتنا کم وقت ہوا ہے کہ اُن کا راستے میں مجھ سے ٹکرا جانا یقینی تھا۔ جب میں نے اُن کا حلیہ اور نام وغیرہ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ وہی آدمی تھا جس سے ملنے کے لیے میں اکثر بے قرار ہو جایا کرتا تھا۔ میں اُلٹے پیروں واپس ہوا تیز تیز قدموں سے سڑک پر آیا۔ سڑک تھوڑی دور چل کر دو راستوں میں بٹ جاتی تھی۔ میں وہاں تک گیا اور پھر اُس راستے کو چھوڑ کر جس سے خود آیا تھا دوسرے راستے پر کچھ دور تیز چلا بھی کہ مبادا وہ آدمی دوسری سڑک پر واپس جاتا ہوا مل جائے لیکن وہ مجھے بہت دور تک نہیں دکھائی دیا۔ میں مایوس ہو کر گھر واپس آ گیا۔

میں نے طے کر لیا کہ جیسے بھی ہو میں اُس سے مل کر رہوں گا۔

میں اپنے اُس ارادے کے بارے میں جب سوچتا ہوں تو مجھے کہیں سے بھی اپنی نیت میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی۔ میں نے واقعی بڑی نیک نیتی کے ساتھ طے کیا تھا کہ میں اُس آدمی سے بہر طور ملوں گا۔ لیکن بُرا ہو اُن گوناگوں مصروفیات کا کہ میں اُسے پھر بھلا بیٹھا۔

ایک دن دفتر کی کینٹین سے اُٹھ کر جب میں اپنی میز پر آیا تو پتہ لگا کہ ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا جو مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ نام پتہ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ صاحب وہی آدمی تھے۔ مجھے ایک ٹیلیفون کا نمبر بھی بتایا گیا اور کہا گیا کہ میں اُس نمبر پر اُن سے رابطہ بھی قائم کر سکتا ہوں۔ میں نے مارے خوشی کے فوراً وہ نمبر آپریٹر سے مانگ لیا۔ سوچا تھا فون پر بات کر کے ہم ایک دوسرے سے ملنے کے لیے جگہ اور وقت طے کر لیں گے۔ آپریٹر کو فون کا نمبر دے کر میں اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ آپریٹر نے مجھے اطلاع دی کہ نمبر فی الحال انگیج ہے۔ شام کو جب میں دفتر سے اٹھا تو مجھے یاد آیا کہ نہ تو آپریٹر نے ہی وہ نمبر مجھے لا کر دیا اور نہ میں نے ہی اُس کو دوبارہ نمبر لگانے کی یاددہانی کرائی۔ مجھے اس بات کی بڑی کوفت تھی۔

پھر بہت سے دن گزر گئے۔
شاید مہینوں گزر گئے
ایک دن اتوار کے روز گھر پر جاڑے کی دھوپ میں آرام سے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ وہ مجھے یک بارگی یاد آ گیا۔
میں نے طے کر لیا کہ میں اُسی وقت اُس سے ملنے کے لیے جاؤں گا۔!
اور میں اُس سے ملنے کے لیے چل پڑا۔
یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اس بار ملے بغیر واپس نہیں آنا ہے۔
اُسے ڈھونڈھ نکالوں گا اور جیسے بھی ہو اُس سے مل کر ہی دم

لوں گا۔

گھر پہنچا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ گھر پر موجود تھا۔
باہری کمرہ کھول کر مجھے اندر بٹھایا گیا۔
چند لمحوں بعد وہ میرے سامنے تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے تپاک کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ دیر تک یہ بیان کرتے رہے کہ کتنی کتنی بار ہمارے دل میں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے شدید خواہش جاگی۔ پھر ہم یہ بھی بتاتے رہے کہ کس کس طرح سے ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کی اور کیوں ہم نہیں مل پائے۔

میں نے اُسے بتایا کہ میں نے اُس کو بس میں جاتے دیکھ کر آواز دی تھی۔

اُس نے بتایا بتایا کہ اُس نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا۔
میں نے اُسے بتایا کہ رستوران پہنچنے میں مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی۔
اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کس طرح میرے گھر سے ناکام لوٹا تھا۔
وہ چُپ رہا۔
میں چُپ رہا۔
اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے ملنے کا متمنی تھا۔
میں نے اُسے بتایا کہ میرے دل میں اُس سے ملاقات کی اکثر خواہش جاگی۔

وہ چُپ رہا۔
میں چُپ رہا۔
اُس نے مجھے چائے پیش کی۔
میں نے اُس کو سگریٹ پیش کی۔
پھر وہ خاموش ہو گیا۔
پھر میں خاموش ہو گیا۔

میں جب اُس کی بیٹھک سے واپس باہر نکلا تو گردن جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔
وہ جب بیٹھک کا دروازہ اندر سے بند کر رہا تھا تو اُس کی نظریں بھی جُھکی ہوئی تھیں۔

اب آئندہ ہم ایک دوسرے سے کب ملیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ کل ہی ملاقات ہو جائے۔
کل جو بہت پاس کا وقفہ ہوتا ہے۔
لیکن ہم دونوں میں کل بھی اور کتنا کچھ مشترک رہ جائے گا یہ بات نہ میں جانتا تھا اور نہ وہ آدمی۔ شائد ہم دونوں بے قصور ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی جگہ شرمندہ تھے۔

غم

"دنیا کا کوئی ایسا غم بتاؤ جولی جس میں شدّت ہو، جس کا احترام اتنی دور تک کرسکوں کہ موت خوش گوار ہو جائے، کہ جیون سارا کا سارا سپھل ہو جائے"

جب اُس نے غم کی بات بہت بار کی اور بہت بار غمگین ہوا تو ایک دن جولی کو اُس پر ترس آ گیا۔

جولی، دن بھر کی تھکی، اپنے ٹائپ رائٹر سے چھوٹی، کینٹین سے منگائی گئی دو کپ چائے کی خالی کی گئی کیتلی کی طرح بے مصرف اپنا ڈھکن کھولے بین پر ایک طرف پڑی تھی۔

وہ کرتی بھی کیا ___؟ اپنے محور سے کٹی، اپنے اندیشوں سے سہمی، مضمحل بے آواز جسم کی دغاباز بیساکھی پر اپنا سارا آپا ٹانگے، اپنی چوٹی کے ٹوٹے ہوئے بندھے سے بے خبر، دنیاداری کی گیلی اوڑھنی کو مروڑ مار اور چٹیل دھوپ میں سکھانے کا ایک دھندلا، مہنگا اور بے درد سا خواب لیے اپنے پیر کے انگوٹھے کی پالش گھورتی رہی ___ اتنا بڑا نگر، روشنیاں، اندھیرے، تنہائی، ہر

اُن وقت ایک ننگی تلوار کے مانند سر پر لٹکتا ہوا، ایسے میں کوئی غم کا پتہ ٹھکانہ پوچھے تو عورت، ہونٹوں سے، باہوں سے، مدھم زم ز اسپرش سے جس کا ہو جیا بھی ہو غم جگمگا دیتی ہے۔

دفتر کے کمرے میں ایک پل کی فرصت میں، ہوتا بھی کیا تھا۔

بیلے سی بند، گلاب سی ادھ کھلی، پسینے میں نہائی، پلکیں ٹھہراتی، جھپکاتی، من میں ننھی سی ہائے کو بھینچے، باہر بیٹھے چوکیدار کی بے مطلب کھنکھاروں سے بے سُدھ جُولی بارش کے پہلے چھینٹے کی مدھم سی رینگن سے دلار کرتی رہی۔

اُس پار ریل کی پٹری، اس پار گھنے گھنے پیڑ، ننھی بوندیاں، جھولے، ہری لال، پیلی اوڑھنیاں، چنکیاں، کرتی میں دکھتی سی اُبھری دو گٹھلیاں، جونیر ہائی اسکول کا نٹکا ماسٹر۔

"سورداس جی کہتے ہیں، جسودا ہری پالنا جھلاویں:

"منشی جی، ہاتھ اُدھر ہٹاؤ نا۔"

پھر سا، کانتا، بلّم، ادھ کٹے کھیتوں پر پیاسی چماروں کی یلغار، دھوپ جھلستی ہانپتی کھوپڑیوں کو تڑخاتی، کسی بھڑبھوجے کے الاؤ کی طرح روشن کھڑی کھڑی جھکتی، جاگتی آنکھوں سے سارے قتل ہوتے دیکھتی رہی۔

لمبی سی بل کھاتی پگڈنڈی، سائکل کے کیریر پر جھولتا، ہچکولے کھاتا، انجانے، اَن دیکھے رستوں کی خوشبو کو مانگ میں بساتا، جولی کا چڑیا سا ننھا سا دل شہر کی اجنبی ہواؤں کی آہٹ پر سیجتا چلا گیا۔

"دنیا کا کوئی ایسا غم بتاؤ جولی جو دروازے پر بار بار دستک نہ

دے، آ گئے اور رہ جائے، جائے تو آئے نہیں۔ غم جس کی خاطر ہم گھر کے آنگن میں پودوں کی کونپلیں اُگاتے ہیں۔ میں اس غم کی قلموں کو چھوٹے بڑے گملوں میں گھر کی منڈیروں پر، کمروں اور کونوں میں ڈھنگ سے سجاؤں گا۔ میں اُن کی سیوا میں، جو کچھ بھی بیتے گا ہر رات بستر پر چپکے سے سہہ لوں گا۔"

اور اس سیوا میں، جو کچھ بھی بیتا، بیچھے لگے حیران پر بیتا چلا گیا۔ جو کہ اٹھانے کی عادت نے اندر اور باہر دیکھا اور بیتا۔ کھلی کھلی آنکھوں اور رُکی رُکی سانسوں سے باتوں کی، وعدوں کی خواب گاہوں میں جھانکا۔ ٹوٹی، جڑی، پھر ٹوٹی پھر جڑی ـــــ باہر سے اُجلی، اندر سے پھپھوند لگے ناریل میں نیلی، آنکھوں میں گرم گرم چبھتے سے پانی کو پی پی کر کڑوے کسیلے لب اشک سے اُٹھتی بسا ہند کو بھول کر ادھ کھلی گاڈرج کی الماری سے جھانکتے فل اسکیپ کاغذ کی گوری سی جلد کو تکتی ہی رہ گئی۔

شکر مل کا لدفی۔ کالا کسیلا، بدلیہ دار مل کی شریانوں سے بہہ نکلتا، نالے میں گرتا، دھیمی رفتار سے رینگتا، جانے کہاں چلا جانے والا، کچلے اور پسے ہوئے گنوں کا تفضد، میونسپل مہلا ودیالے کے اونگھتے ٹھیلے کا مٹ میلا، نچا کھچا پردہ، ڈابر کی تنگی، کہاروں کی راتوں جیسی پتلی سی سڑک، کناروں پر قطاروں میں بندھے اونچے گھنے جامن کے پیڑوں کے پتوں پر چمنی سے اُٹھے ہوئے کوئلوں کے ذرّوں کی ہلکی سی تہہ۔

کوارٹر کا کمرہ، بھگوان کی مورتی، کتابیں، گراموفون، دو چار ٹوٹے ریکارڈ،

پاؤڈر کا خالی سا اُداس سا ڈبہ، کھڑکی کے اُس پار بر جھن کی دکان پر رادھے فورمین کے مسٹنڈے لونڈے کے ہاتھوں میں کوک شاستر کی گندی سی بچھی پچھی کتاب۔ چوراستے کے نل کی دیوار پر کوئلے سے لکھا ہوا ـــ "جولی رانی ایک چمی دے دو" بہت سے ٹائپ رائٹروں کی کھنکھناہٹ، شارٹ ہینڈ کے ڈکٹیشن . . . .

"دنیا کا کوئی ایسا غم بتاؤ جولی، جس میں تمھارے ہونٹوں کی آگ، تمھارے سینے کا گداز، تمھاری کمر کا لوچ، سانسوں کی خوشبو اور ہاتھوں کی چاندی ہو جسے میں اپنی باہوں میں سمیٹ کر یوں رکھ لوں کہ وقت اپنی رفتار کھو بیٹھے۔"

جب اُس نے بھی غم کی بات بہت بار کر لی اور بہت بار غمگین ہوا تو ایک دن جولی کو اُس پر ترس آ گیا۔

جولی شیشے کی میز پر قرمزی پیپر ویٹ کے نیچے مزے مزے پھڑ پھڑاتے ہوئے ننھے سے کاغذ کو کھوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

شہر کے کنارے پر چھوٹا سا فلیٹ، دفتر کے صاحب کے پاس والا کمرہ، ٹوائلٹ کے پیکٹوں پر بندھے ہوئے خوبصورت ربن، ہوٹلوں کے بیروں کی چبھتی ہوئی آنکھیں، سینما کی سیٹوں کے نمبر پڑے اجلے ٹکٹ، کپڑے پر کہیں گیلے پن کا احساس۔ بے چین جاگی سی راتیں، مُہر بند ڈبوں کے چٹنی اچار، دیوار پر الیکٹرک واچ، زمین پر قالین۔ ساڑی کی اڑسن میں پھنسا ہوا کنجی کا گچھا، گچھے میں لمبی سی گاودریج کی کنجی ـــ گدرائی یا نہیں، پیٹ کی کھال

پر اجلا اور دبیز سا پڑا ہوا ایک بل، ماتھے پر موٹی سی بندیا، دانتوں میں روشنی
پسی ہوئی۔

"دنیا کا کوئی ایسا غم بتاؤ جو ہلی ......"

"سنو۔ غم کی بات نہ کرو، میں بھی نہیں کرتی۔"

"اچھا۔"

"بچھڑ جائیں گے ___"

"چلو، مجھے تو وقت کاٹنا ہے۔"

"ایک بات کہوں ___؟"

"کہو۔"

"تمھارے پاس وہ تو ہوگا؟ میں کوئی Risk نہیں لوں گی۔"

"راستے میں لے لیں گے۔"

"اور دیکھو تمھیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیا ___؟"

"میرا اوپر کا بدن دُکھتا ہے۔"

"آئی سی۔"

کار کی پچھلی سیٹ، کوکو کولا کی بوتلیں، آئس کریم کے ڈبے، پانوں کے
دونے، پٹرول کی بو، رفتار ہچکولے، کندھوں سے، بانہوں سے، کولھوں سے
مس ہو ہو کر بے کیف، بے معنی، بے چہرہ جسموں کا بدمزہ تعارف ___

"دنیا کا کوئی ایسا غم بتاؤ جو ہلی ___؟"

تیسری بار اُس کے پوچھنے پر جُولی سے نہ رہا گیا۔ عجلت میں کہہ بیٹھی۔

"کیسا غم۔۔۔"

"جو۔۔۔۔۔جو۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تم لوگ عورتوں سے غموں کا پتہ ٹھکانا کیوں پوچھتے ہو؟"

"بہت اُداس ہوں جُولی ـــ جُولی یقیں کوئی غم نہیں؟ تمھارا اس دنیا میں کوئی نہیں ـــ؟"

"میرا ـــ؟ میرا ایک لڑکا ہے۔"

"کہاں ـــ؟"

"بورڈنگ میں۔"

"کتنا بڑا ـــ؟"

"نو سال کا ـــ"

"تمھاری شادی کب ہوئی؟"

"دس سال پہلے۔"

"ہاں شوہر ہیں۔"

"تمھارے پتی سے کیا تمھاری؟۔۔۔؟"

"ہاں، ہوگئی ـــ"

"کیوں ـــ؟"

"وہ میرا غم ہے، میں مردوں سے غموں کے پتے ٹھکانے نہیں پوچھتی۔"

"تم اپنے پتی سے کب سے نہیں ملیں؟"

"دو دنوں سے۔"

"کیا؟ وہ دو دن پہلے تم سے ملا تھا؟"

"ہاں؟"

"کیوں؟"

"ہم دونوں اکٹھے اپنے بیٹے سے بورڈنگ میں ملنے جاتے ہیں۔"

"جولی، میں تمھیں کیسا لگتا ہوں؟"

"اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"جولی، مجھ سے شادی کروگی؟"

"کیوں؟"

جولی، گاؤں سے نکلی، شہر میں بسی، کھلتی کھلتی باہر سے اندر تک کھل چکی تھی۔ الگ الگ موقعوں پر، الگ الگ بہانوں سے دو ایک اس کے ساتھ سو چکے تھے۔ پچکے سے بولی

"تم میرے ساتھ بس جاؤ نا۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک بات نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں تمھیں سمجھا نہیں پاؤں گی۔ کیوں کہ میں اُن عورتوں میں سے ہوں جو ماں بھی بن سکتی ہیں۔"

"تو کیا ہوا، وہ بچہ ہمارا ہوگا۔"

"ہمارا تو ہوگا، پر تم وشواس کروگے؟"

"تم ساتھ دوگی تو کروں گا۔ سب ہی کرتے ہیں۔"

"گود بھر جانے پر عورت مرد سے زیادہ بچّے کا ساتھ دیتی ہے۔"

"اور اس بچّے کے لیے اسے ایک مرد کی تب بھی شائد ضرورت ہوتی ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ میں کماتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے لیکن تم قسم کھا لو کہ تمھاری کوکھ میں صرف میری اولاد ہوگی۔"

"شاید اولاد کی حد تک! زمانے نے جتنا دیا ہے اُس پر بھروسہ کرتے ہوئے کہو تو قسم بھی کھا لوں۔ لیکن تم آج اور سوچ لو۔"

دوسرے دن سُرخ سرخ ساڑی میں یونہی تھوڑے سے گھٹنوں کو پہنے دروازے کھولے دوپہر تک اپنے کمرے میں بیٹھی آتے اور جاتے پلوں سے کھلواڑ کرتی ہوئی جڑلی سے جب اُس نے چلنے کو کہا تو بستر سجا کر کمرے میں تالہ لگا کر وہ خوابوں کی بے نام، بے رُوح وادی میں چلنے لگی۔ کچھ دُور چل کر وہ اُس کو ایک چائے خانے میں لے گیا۔ دو گھڑی چائے پینے میں بس بے ارادہ سا کہہ اُٹھا۔

"میں نے بہت سوچا ہے جڑلی۔"

"کیا ۔۔۔؟"

"میں نے اپنے کو بار بار تولا ہے۔ تم نے ۔۔۔ تم نے ۔۔۔ اچھا ایک

بات بتاؤ۔۔۔۔"

"ہوں۔"

"تم نے اولاد کی حد تک والی شرط کیوں لگائی۔"

اس لیے کہ تمھارے اندر کے باپ کو دُکھ نہ ہو۔"

"لیکن میرے اندر کا شوہر ۔۔ ؟"

"میں اپنے اندر کی بیوی کو سمجھا لوں گی، تم اپنے اندر کے شوہر کو سمجھا لینا۔"

"اچھا ایک کام کرتے ہیں، آج اور ٹھہر جائیں، کل کا دن ٹھیک رہے گا۔"

"کل ۔۔"

"ہاں ۔۔"

"چلو، ٹھیک ہے۔"

"میٹنی کے دو ٹکٹ لے لوں۔ چلو گی ؟"

"چلو ۔۔"

"رات کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔"

"اچھا ۔۔"

اس رات اُسے اپنا بدن دفتر کی فائل سا لگا۔ فیتہ کا کھلنا، کور کا پلٹ جانا، اور قلم کا ایک پل چل کر رک جانا، تمام مناسب فائلیں یونہی Dea کی جاتی جاتی ہیں۔

دوسرے دن صبح سے لے کر شام تک، اس انوکھے سے دن کی بڑی سیوا کی جولی نے۔ اس سیوا میں جو غم بھی بیتا، پنکھ لگے جیون سا بیتتا چلا گیا۔ عورت کا عورت پن کھُلی کھُلی آنکھوں اور رکی رکی سانسوں سے باتوں اور وعدوں کی خواب گاہ میں جھانکتا ہی رہ گیا۔

■

آبھی ابھی

جب اُس کا کارڈیوگرام تیار ہوا تو اُس کے دل کی کیفیت کے زائچے کا کاغذ ہر ایک نے پڑھا۔ سب کو حیرت ہوئی کیوں کہ حیرت کی بات صرف اتنی تھی کہ اس طرح کی رپورٹ سے اُن تجربہ کار لوگوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اُس کاغذ پر لکھا تھا۔

کوئی محرومی نہیں۔ زندگی نے سب کچھ دیا۔ چھوٹے چھوٹے دکھ اور چھوٹے چھوٹے سکھ۔ تین لڑکے ہوئے۔ اُن کو پڑھایا لکھایا، اُن کی شادیاں کیں، اُنھیں گھر بسا کر بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے رہتے دیکھا۔ اب جب بھی موت آئے گی آرام سے مرجاؤں گا۔ لیکن موت کیوں آئے گی۔ اگر اُسے آنا ہی ہے تو ابھی کیوں آئے گی۔ دو چار دس بارہ سال بعد کیوں نہیں آئے گی۔ ہائے تو کیا میں مرجاؤں گا۔ یہ صبحیں، یہ شامیں، یہ ہنستے بولتے میرے ننھے ننھے پوتی پوتے۔ میرا لڑکا میری بہویں۔ یہ کرسی جس پر روز صبح ہاتھ دھو کر میں ناشتے کے لیے بیٹھتا ہوں یہ خالی ہو جائے گی، مجھ سے خالی ہو جائے گی۔ یہ کوٹ جو کھونٹی پر ٹنگا ہے جیسے

بازار جانے سے پہلے میں پہنچتا ہوں۔ وہ سڑک کا موڑ جہاں چھوٹا سا پُل ہے اور جس پر سہ پہر کو میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہوں وہ سب مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ بازار میں سبزی والے ہر شام جو مجھے سلام کرتے ہیں اور ہری ہری سبزیاں تول کر میرے جھولے میں ڈالتے ہیں اور پھر کیلنڈر پر اُن تاریخوں پر بنے ہوئے نشانات جن تاریخوں پر مجھے' شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں دوست احباب کے گھروں پر جانا ہے وہ سب چھوٹ جائے گا' ایک پل میں کہیں کھو جائے گا۔

موت آئے گی تو ضرور۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی آجائے۔ ابھی جب کہ میرا بڑا لڑکا پردیس میں ہے۔ کتنے دنوں سے اُس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ ہائے وہ کتنا بے مروت ہے! لیکن وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ جہاں روٹی روزی لے جاتی ہے' جانا پڑتا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ میری دو اولادیں میرے پاس ہیں۔ اُن کی بیویاں میری خدمت میں لگی ہیں' ابھی میری بڑی بہو نے میرے سر کے نیچے میرا تکیہ ٹھیک کیا ہے۔ میری بیوی' میری باوفا' خدمت گزار بیوی وارڈ کے باہر پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ ۳۵ سال سے وہ میری زندگی کے ایک ایک پل کی ساجھے دار ہے کیسا تڑپ رہی ہے وہ ـــ میں مر جاؤں گا تو کیسے جی پائے گی وہ۔ لیکن کیا میں اپنے بڑے لڑکے کو اب کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ اتنی دور سے کیسے آئے گا وہ۔ ـــ ہائے دونوں ہاتھوں سے وہ اپنا کلیجہ نہ پکڑے گا کہ میں اپنے باپ کے آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ کیا میں مر جاؤں گا۔

کارڈیوگرام پر دل کی کیفیت کا زائچہ۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں اور اُس

کے ارتعاش کے ساتھ سا تھ اتنا سب کچھ لکھ رہا تھا۔ کاغذ برابر باہر آرہا تھا اور وہ تجربہ کار لوگ اُن اونچی نیچی لکیروں کو غور سے دیکھ رہے تھے، اُنھیں پڑھ رہے تھے۔ تب اُن میں سے کسی نے کہا کہ اُس کو مارفیا دے دیا جائے لیکن بالآخر یہ طے پایا کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے اور زائچہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اُنھوں نے پھر کاغذ کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔

اُس میں لکھا تھا:

اے پالنے والے میں نے بہت گناہ کیے ہیں۔ مجھے دوزخ کی آگ سے بچا!! اے معبود میں تیرا شکر بجا لاتا ہوں اور تیری بخشی ہوئی نعمتوں کے لیے کروٹ کروٹ تیرا احسان مند ہوں۔ میرا منھ اس لائق نہیں کہ کلماتِ شکر زبان پر لا سکوں۔ لیکن تو رحیم و کریم ہے۔ خطاکاروں کی خطاؤں کو درگزر کرنے والا۔ تیری شان و عظمت کے قربان میری بخشش کر، مجھے اپنی رحمتوں کی پناہ میں لے لے۔ میرے پاس تجھے دینے کے لیے کچھ نہیں۔ مجھے بچالے، مجھے زندہ رکھ۔ مجھے بخش دے۔ میں مرنا نہیں چاہتا کہ دوزخ کی آگ ..... میں نے کچھ یتیموں کو ستایا مگر..... اے رحیم و کریم جوانی میں گرمیوں کی دوپہر گھر کی چھت پر اُس خادمہ کی لڑکی کے پستانوں پر ..... میرا ہاتھ دوزخ کی آگ سے بچالے کہ زندگی ابھی مجھے اور دے دے ..... اور ذائقہ اُن پاپڑوں کا جو میں چاولوں کے ساتھ کھاتا ہوں ..... کہ سب کچھ تیری رحمت پر منحصر ہے ..... اور وہ امرود بس ایک امرود ہے جسے ڈاکٹر نے مجھے روزانہ کھانے کے بعد کھانے کے لیے کہا ہے اور بکری کی ہڈیوں کا شوربہ اور چھلکے کہ اُن کا ذائقہ جو مٹر کی گرم گرم پھلیاں

چٹنی اور دہی ڈلوا کر میں چاٹ والے کے ٹھیلے سے لے کر کھاتا ہوں... اور وہ بوڑھا تانگے والا جسے جوانی کے جوش میں میں نے مارا تھا اور کرایہ بھی نہیں دیا تھا کہ... کہ میں بہت گنہگار ہوں اور تو بخشنے والا ہے۔

ان تجربے کار ڈاکٹروں نے جملوں کی بے ربطی پر کارڈیوگرام کی مشین کی طرف غور سے دیکھا اور اُس میں کسی کل کو بار بار ادھر اُدھر ہلا ڈلا کر دیکھنے لگے کہ یہ بے ربطی مشین کی خرابی کی وجہ سے تو نہیں۔ تو اس بار اُنھوں نے دل کی کیفیت کے زائچے پر دیکھا تو لکھا تھا:

مریم کا شوہر مجھ پر شک کرتا تھا۔

میرے بستر کے قریب بیوی کیوں رو رہی ہے۔

میری پوتی کے دل میں چھید ہے۔ اس ننھی سی جان پر خدا کو رحم نہ آیا۔

میرا جوتا پھٹ چکا ہے۔

پوتی کے آپریشن کے لیے اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔

اُس دن اُس کا شوہر میرے پیچھے چاقو لیے گھوم رہا تھا۔ جوانی کے دھوکے... کہاں گئے وہ دن:

میں نے اپنی بیوی کی زبان پر انگارہ رکھ دیا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولی۔

مجھے بچا لو۔ مجھے بچا لو۔

میں نہیں مروں گا۔ مجھے بچا لو۔

ابھی صرف ساٹھ برس ہی تو گزرے ہیں۔ ممو خاں ۷۵ سال کے ہیں اور زندہ ہیں۔

لکڑیاں چیرتے ہیں۔ کریمن کی کمر دہری ہو چکی ہے مگر سوئی میں دھاگا ڈالتی ہے کہتی ہے ایڈورڈ صاحب بہادر کو اپنی آنکھوں سے اُس نے دیکھا تھا ـــ مجھے بچا لو:
...... میرا درد ...... یہ درد یہ درد‘ یہ سانسیں‘ یہ ہاتھ پیروں میں تھرتھری‘ یہ جلتے ہوئے پاؤں۔ بستر جیسے کمرے میں تیر رہا ہے۔ کیا موت اسی طرح آتی ہے۔ کیا سب یوں ہی مرتے ہیں۔ یہ چھاتی میں دھوکنی سی کیا چل رہی ہے۔ یہ زبان اتنی موٹی سی‘ اتنی بے ذائقہ سی‘ اتنی بھاری سی اور یہ جبڑے اتنے بوجھل سے کیوں ہو رہے ہیں اور یہ گلے میں‘ گلے کی دیواریں سوئیاں سی کیوں چبھ رہی ہیں اور یہ آنکھوں کے ڈھیلوں میں اندر بہت اندر چڑیاں جیسے چونچیں مار رہی ہیں اور باہر بارش ہو رہی ہے کہ کانوں کے پردوں پر ٹپ ٹپ کر کے کچھ مستقل بجے جا رہا ہے۔ نتھنوں میں اور ہونٹوں پر جیسے لُو کی گرمی کا احساس کیوں ہے۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں کو کوئی موڑ رہا ہے۔ پسلیوں میں درد اور سینے کے بائیں طرف جیسے اندر کسی نے جلتا ہوا توا سا رکھ دیا ہے ...... موت کو جھیلنا بڑا مشکل ہے۔ یہ وہ گھڑی ہوتی ہے جب کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا‘ یہ اذیت دھیرے دھیرے بڑھتی جائے گی‘ پھر کیا ہوگا ...... ؟ اس تکلیف کی کیفیت کیا ہوگی۔ کوئی نہیں بتا سکا ہے۔ ایسے سب ایسے جھیل کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے بھی اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وہ کیفیت اب بہت قریب ہے۔

تب اُن تجربہ کار لوگوں نے بالآخر یہ طے کیا کہ مریض کو مارفیا دے دینا چاہیے اور اُنھوں نے مریض کو مارفیا دے دیا ـــ پھر اُن تجربہ کار لوگوں کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ آگے کیا ہوا۔ مریض کے دل کی دھڑکنوں کو عارضی سکون دے

کر وہ سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

مارفیا زدہ مریض پُرسکون ہو گیا۔ بعد میں ان لوگوں نے جیسا جیسا تجویز کیا وہ ہوتا رہا۔ اور دن گزرتے رہے ...... صبح مریض کی بیوی وارڈ کے باہر نماز ادا کر کے مریض کے لیے دودھ کا پیالہ لے کر آتی۔ مریض باتیں کرتا۔ دن چڑھے' موسمی کا رس پیتا۔ دوپہر کو اس کی بہو اُس کے لیے تازہ تازہ کھانا لے کر آتی۔ شام کو اُس کی پوتی پوتے اُجلے اُجلے کپڑے پہن کر پھولوں کا گلدستہ لے کر آئے اور مریض اُن کے گالوں کو چوم کر اُن سے ہنستا کھیلتا۔ رات میں اس کی بوڑھی بیوی اُس کے سرھانے بیٹھ کر تسبیح پڑھتی اور وہ اسلامی فتوحات کے معرکے کتابوں میں سے پڑھ کر اپنی بیوی کو سناتا اور دین و ایمان کی اچھی اچھی باتوں کو پڑھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کے سبب آنسو آجایا کرتے۔ وہ تھوڑی دیر رو کر پھر کتاب سنانا شروع کرتا۔ رات وہ اپنی پسندیدہ کروٹ کے بل لیٹ کر تھوڑی دیر جمائیاں لیتا اور پھر ٹرنکولائزر کے دھیمے دھیمے سروں میں آرام سے سو جاتا۔

اب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا شیو بناتا۔ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو کر وہ چپل پہنتا اور چہل قدمی کرتا ہوا وارڈ سے باہر آتا اور کچھ دیر باہر کی چہل پہل کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا اور اُس بوڑھے فقیر کو اپنے ہاتھ سے پیسے دینا نہ بھولتا جو روزانہ اُس کی جان و مال کو دعا دیا کرتا تھا۔

پہلے ہر سویرے اُسے کارڈیوگرام کی مشین کے سامنے پیش ہونا پڑتا اور اب اُسے پندرھویں دن آنا ہوتا۔ اسپتال آنے سے ایک دن پہلے وہ کسی طرح سے

اپنے کو بازار کے اُس موڑ سے دور رکھتا جہاں ایک نامی ٹھیلے والا مٹر کی ٹکیاں بڑی سی کڑھائی میں سینکا کرتا اور انھیں دونے میں رکھ کر اُن میں چٹکی سے نمک مرچ اور مسالے ڈال کر اور اُن پر میٹھی چٹنی اور دہی کی تہہ لگا کر لوگوں کو کھلایا کرتا اور لوگ مزے لے لے کر کھایا کرتے۔

ایک دن وہ اپنے پوتوں کو ساتھ لے کر سنیما دیکھنے گیا۔ ایک دن اُس نے اپنے چھوٹے لڑکے کے نئے مکان میں بجلی کا میٹر لگوانے کے لیے تین میل پیدل چل کر بجلی گھر میں درخواست لگائی۔ ایک دن وہ اپنی بڑی بہو کی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر ایک ہومیو پیتھ کو دکھا آیا۔ اور کئی دن اُس نے لگاتار چاٹ والے کے ٹھیلے کے کنارے کھڑے ہو کر چوری چھپے چاٹ اُڑائی۔ وہ اپنی جیب میں ہمیشہ اپنی پاکٹ منی ضرور رکھتا۔ بھنے ہوئے چنے وہ کھاتا، تربوز کی پھانکیں وہ خریدتا اور جلدی جلدی ایک کنارے کھڑے ہو کر کھا لیتا۔ گنے کا رس نکلوا کر پیتا، اُبلے ہوئے سنگھاڑوں سے سوندھی سوندھی گودیاں لے کر جیب میں بھر لیتا اور راستہ چلتے اُنھیں کھاتا جاتا۔

اُس نے اپنے لیے نیا سوٹ سلوایا۔

بڑے لڑکے نے اُسے قارن سے پیسے بھیجے تھے اُس سے اس نے اپنے لیے ایک شاندار پمپ شو خریدا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں پھر سے ٹسٹ کروائی تھیں اور نیا نمبر ملنے پر ایک خاصا بھاری بھرکم فریم بھی خریدا تھا جو اُس کے چہرے پر علیحدہ سے ایک وجود کا احساس دلاتا تھا۔

اس بار جب اُسے کارڈ پروگرام کے لیے تیار کیا گیا تو اُس کے دل کی کیفیت

کے ۱۱ بجے کا کاغذ جن آڑی ترچھی اور ادھی بچی لکیروں کو ساتھ لے کر باہر نکل رہا تھا اُن کو ان تجربے کار لوگوں نے جب پڑھا تو اُس میں لکھا تھا

میرا چھوٹا لڑکا رات کو دیر سے واپس آتا ہے۔ اُس کی بیوی سیدھی سادی ہے، کچھ بولتی نہیں۔ میں حرامزادے کو کئی بار سمجھا چکا ہوں مگر نہیں مانتا اب اگر دیر سے آیا تو سؤر کے بچے کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا۔ اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ دو ہاتھ میں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔

ان ہاتھوں نے لاکھوں کمائے، آج بھی یہ ہاتھ کسی کے دست نگر نہیں رہیں گے۔ دوسرے صاحبزادے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے روپیہ دے کر خرید لیں گے۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ ایسے ہی دنوں کے لیے میں نے اپنا فنڈ الگ سنبھال کر رکھا تھا۔ دو آٹو رکشا خرید کر کرائے پر چلاؤں گا۔ ایک مکان بیچ کر کپڑے کا کاروبار کروں گا۔ بڑے بڑے زنگ لگ رہا ہے۔ امجد کئی بار کلکتے بلا چکا ہے۔ لکھا ہے جو عیش یہاں ہے وہ تم نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ کچھ روز کے لیے میری مہمانی قبول کرو پھر سے جوان ہو جاؤ گے۔ سالے وہی دن اور وہی رات۔ ہرگز یہ مکان میں کسی کو نہیں دوں گا۔ ضرور بیچ دوں گا۔ میں اسے بڑی بہو دکھاوے کی باتیں کرتی ہے۔ اُس نے لڑکے کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ سمجھتی ہے کہ گھر کی سب سے بڑی وہی ہے۔ سب کے دماغ ٹھیک کر دوں گا۔ میں کپڑے کی دکان میں بہت منافع ہے۔ پھر ہم دونوں بڑھیا بڈھے ہوائی جہاز سے حج کو جائیں گے اور وہاں سے واپسی پر یورپ کا دورہ کریں گے۔ کتنی خوبصورت دنیا ہے یہ، کتنا کچھ دیکھنے کو پڑا ہے، کیا کچھ کرنے کو ہے۔ ابھی تو۔ ابھی / ابھی / ابھی

تجربہ کار ڈگ جلدی سے کارڈیو گرام پر جھک گئے۔

ابھی تو / ابھی / ابھی / ابھی / بس مسلسل ایک ہی عبارت اُن دھڑکنوں سے کاغذ پہ اُتر رہی تھی۔

وہ سب باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے مبہوت ہوکر زائچہ کو دیکھ رہے تھے بے بس ہوکر دیکھ رہے تھے۔ ابھی تو / ابھی ــ ابھی ابھی ــ ابھی ــ !

اور پھر زائچہ گونگا ہو چکا تھا ــ کاغذ سے سارے اُتار چڑھاؤ ختم ہو چکے تھے۔ وہاں سیدھی سی ایک بے حس بے جان لکیر کے علاوہ کچھ نہ تھا جس کے کوئی معنی نہ تھے کوئی مطلب نہ تھے اور سب کچھ ابھی ابھی ہوا تھا۔

پوشاک

اور تب اینڈرسن کے اُس عاقل بادشاہ نے اپنی رعایا کی فہم و فراست کو پرکھنے کے لیے یہ کیا کہ وہ اُس پوشاک کو پہن کر ہاتھی پر بیٹھا۔ اراکینِ سلطنت اور اُمرا و منصب داروں کو اپنے ساتھ لیا اور ایک عالی شان جلوس اپنی سواری کا شہر میں نکالا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کی رعایا میں کتنے لوگ عقلمند ہیں، کتنے لوگ اُس پوشاک کو دیکھ سکتے ہیں کہ جسے وہ زیبِ تن کیے ہوئے تھا کیوں کہ کپڑا بننے والوں نے یہی کہا تھا کہ جو کپڑا وہ بادشاہ کی پوشاک کے لیے بُن رہے ہیں اُس کپڑے کو صرف وہی لوگ دیکھ سکیں گے جو دانا اور عاقل ہیں، بے وقوفوں کو وہ کپڑا نظر نہیں آ سکتا۔

کپڑا تیار ہوا، اُس کی پوشاک سِلی اور بادشاہ نے اُسے پہنا، قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اُس نے اپنا جائزہ لیا تو اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ننگا ہے۔ اُس کے بدن پر کوئی پوشاک نہیں تھی۔ لیکن یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کپڑا جس کی تعریف اُس کے درباریوں، وزیروں، دوستوں

عالموں اور خدمت گاروں نے کی ہے وہ پوشاک بادشاہ کو خود کیوں نظر نہیں آ رہی ہے۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اگر وہ یہ بات سب سے کہہ دے کہ اُس کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں ہے اور وہ ننگا ہے تو پورے دربار میں کہرام مچ جائے گا۔ ہر درباری کو یقین ہو جائے گا کہ ہو نہ ہو اُن کا بادشاہ ہی بیوقوف ہے کیوں کہ جو کپڑا اُن سب کو دکھائی دیتا ہے وہ خود بادشاہ کو کیوں نہیں دکھائی دیتا۔

ہینس کرسچن اینڈرسن کا بیچارہ بادشاہ بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ آئینہ کے سامنے اُس نے اپنے کو ہر زاویے سے دیکھا لیکن اُس کے بدن پر کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ وہ تو مادر زاد ننگا تھا اور تب ہی بادشاہ اُس پوشاک کو پہنے پہنے دربار میں آیا۔ لوگوں نے آفرین اور مرحبا کی صدائیں بلند کیں۔ بادشاہ کی پوشاک کی شان میں قصیدے پڑھے اور تب بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ننگا نہیں ہے بلکہ دھیرے دھیرے اُسے اپنی پوشاک کے خد و خال نظر آنے لگے۔ اُس کا حُسن اُبھرنے لگا اور اُس کی قدر و قیمت کے جوہر کھُلنے لگے۔ اُسے لگا کہ اُس کے تار تار میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔ موتیوں اور جواہرات میں گتھی تھی اُسے اپنی قبا نظر آئی۔ اُس کے ایک ایک بند اور تکمے میں لعل و زمرد کی لڑیاں نظر آئیں اور مادر زاد ننگے بادشاہ نے اپنی سواری شہر میں نکالی تاکہ وہ اُس بیش بہا پوشاک کو اپنی رعایا کو بھی دکھا سکے اور اُس سے داد و تحسین پا سکے اور اُس کی فہم و فراست کا امتحان بھی لے سکے۔

بادشاہ اپنے شاندار ہاتھی پر نہایت دھڑلّے سے بیٹھا دو رویہ قطار میں کھڑی

اپنی رعایا کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ شہر میں اعلان ہو چکا تھا کہ آج بادشاہ ایسی پوشاک پہن کر درشن دے رہے ہیں جو صرف عقلمندوں کو ہی دکھائی دے سکتی ہے۔ لوگ دم بخود آنکھیں پھاڑے ننگے بادشاہ کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی کی مجال نہ ہوئی کہ بادشاہ کو ننگا کہہ سکتا۔ سب خاموش تھے کیونکہ سب عقلمند تھے۔ لیکن جب بادشاہ ایک بچے کے قریب سے گزرا جو اپنے دادا کے کندھے پر بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا تو وہ بادشاہ کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا۔ "ارے یہ تو ننگا ہے۔"

دادا نے اُسے جلدی سے ڈانٹا اور بولا۔ "چُپ بے وقوف۔"

○ ○ ○

بادشاہ سب کچھ جانتا ہے، وہ سب کچھ سُن لیتا ہے اور بہت دور تک دیکھتا ہے۔ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی اس لیے اُس کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ بادشاہ نے بچّے کی وہ بات سُن لی تھی ورنہ اینڈرسن ہمیں یہ بات ضرور بتاتا اور یہ کہانی کچھ آگے بڑھتی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ بادشاہ کے کان بہت تیز ہوتے ہیں اس لیے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بادشاہ نے بچّے کے مُنھ سے نکلا ہوا وہ جملہ سن لیا تھا اور وہ جملہ سُن کر اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ اُس کے مُنھ سے جھاگ نکل رہا تھا وہ ہاتھی کو تیز تیز ہنکاتا ہوا اپنے محل واپس آ گیا تھا اور اُس رات اُس نے اپنی رانی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی، وہ سیدھا اپنی آرام گاہ میں چلا گیا تھا اور منادی کرا دی کہ کوئی اُس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ رات گئے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ بار بار اُس کے کانوں میں بچے کی وہ آواز آ رہی تھی۔

"ارے یہ تو ننگا ہے۔"

وہ اُس آواز کی وحشت سے بہت دیر تک لڑتا رہا اور آخر کار نڈھال ہوگیا۔ اُس نے خواب آور گولی کھائی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ جب رات کے دو بج گئے اور وہ سو نہ سکا تو اُس نے کال بیل بجائی اور اپنے پرسنل سکریٹری کو طلب کیا۔ اُسے حکم دیا کہ وہ اُسی وقت کیبنٹ کو طلب کرے کہ وہ فوراً اپنی کابینہ سے مخاطب ہونا چاہتا ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ کابینہ کے ممبر جمع ہوئے اور بادشاہ نے تقریر کی۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ بادشاہ رات دو بجے بھی کابینہ کا جلسہ منعقد کر سکتا ہے اس لیے اُس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کابینہ کا جلسہ ہوا اور بہت زور و شور سے ہوا۔ اُس دن کے جلسے کے ایجنڈے میں صرف ایک ہی موضوع تھا یعنی ہمارے ملک کے بچے بے وقوف کیوں ہیں؟ بادشاہ نے اُس دن جو تقریر کی وہ پایہ کی اُس تقریر سے کم نہیں تھی جو اُس نے پانی پت کی لڑائی سے پہلے کی تھی۔ بادشاہ کی اس دردناک تقریر پر سب رو پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے کیبنٹ ہال ماتم کدہ بن گیا لیکن اُن ممبروں میں ایک زیرک عاقل اور دانشمند وزیر بھی تھا۔ اُس نے بڑی دانشمندی سے معاملات کو قابو میں کیا۔

کیوں کہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ وہاں کوئی عاقل وزیر بھی تھا اس لیے اُس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر اُس رات وہ وزیر باتدبیر بادشاہ کو راستہ نہ دکھاتا تو سوائے رونے پیٹنے کے اور کوئی راستہ نہ نکلتا۔ تو ہوا یہ کہ اُس وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ بچوں کو عقلمند بنانے کا

صرف ایک ہی راستہ ہے اور پھر اُس نے بادشاہ کے کان میں ایسی تدبیر بتائی کہ بادشاہ اپنی مسند سے اُچھل پڑا، اُسی وقت اُس فہم و فراست کے پتلے کو بادشاہ نے خلعت فاخرہ سے نوازا اور اُسے دس ہزاری کے منصب پر فائز کیا۔

اُس وزیر کی تدبیر کے مطابق دوسرے دن سیکڑوں گھڑ سوار اپنے اپنے گلوں میں ڈھولک لٹکا کر محل سے نکلے اور بادشاہ کی بادشاہت میں گلی گلی پھیل گئے۔ اُن کا کام تھا کہ وہ ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر بادشاہ کی پوشاک کی خوبیوں کا بیان کریں، اُس کی شان اور عظمت کے قصیدے پڑھیں، اُس کے حسن اور معیار کی بلندی کو بیان کریں اور پھر اُس دن سے اُس بادشاہ کی بادشاہت میں ٹیلی وژن، سنیما، اخبار اور رسالوں میں بادشاہ کی اُس عظیم پوشاک کے بکھان ہونے لگے۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ اُس بادشاہ کے پاس ریڈیو، ٹیلی وژن اور سنیما بھی تھا اس لیے اُس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بادشاہ کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اُس کی بات کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ صرف یہی نہیں اُس نے ایسے ڈاک ٹکٹ چھپوائے جن میں وہ اپنی پوشاک کو پہن کر کھڑا ہوا تھا اور جسے عقلمند ہی دیکھ سکتے تھے۔ اُس نے گلی گلی چوراہوں پر، بسوں اور ٹراموں، کھیتوں اور کھلیانوں میں، بازاروں اور کھیل کے میدانوں میں، اسپتال اور اسکولوں میں دیوہیکل پوسٹر لگوائے جن میں اُس عظیم پوشاک کے ساتھ بادشاہ کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔ "عقلمند بچّہ دیکھو تمہارا بادشاہ کتنی خوبصورت پوشاک پہنے ہے۔"

نرسری سے لے کر یونیورسٹیوں تک کے نصاب تک ہر مضمون میں بادشاہ کی

پوشاک کا ذکر تھا۔ اسکول میں گائی جانے والی پرارتھناؤں سے بادشاہ کی پوشاک کی درازیِ عمر کی دعائیں تھیں۔ کاپیوں اور نوٹ بکوں کی جلد پر اُس پوشاک کی تصویر تھی۔ ایسے تمام صحافیوں کو ایک ہزاری کے منصب سے پنج ہزاری کے منصب پر پہنچا دیا گیا تھا جنھوں نے اپنے اخباروں کے سب سے زیادہ سنڈے میگزین، پوشاک اسپشل کے لیے وقف کر دیئے تھے۔ ایسے تمام محققوں کو جاگیریں اور خلعت تقسیم کی گئی تھیں جنھوں نے بادشاہ کی پوشاک پر بچوں کے نقطۂ نظر سے تحقیق کی تھی اور ایسے تمام ادیبوں اور شاعروں کو راج کوی تسلیم کر لیا گیا تھا جنھوں نے خونِ جگر سے بادشاہ کی پوشاک میں رنگ بھرا تھا۔ بادشاہ نے ایسی تمام انجمنوں اور اداروں کی مالی امداد تسلیم کر لی تھی جنھوں نے اپنے منشور اور مقاصد میں بادشاہ کی پوشاک نوازی کو شامل کر رکھا تھا۔

جب بادشاہ کو یہ خبر ملی کہ اب بڑے بڑے شہروں میں ایسی اکیڈمی بھی قائم کر دی گئی ہیں جو مختلف زبانوں میں بادشاہ کی پوشاک کے ۱۲ فن باتوں کے ایک ایک تار کو کھول کر رکھ دیں گی اور اُس کے چھپے ہوئے حُسن کو بچے بچے کے دماغ میں پیوست کر دیں گی تو یہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے اکیڈمی کے ناظموں کو مبارک باد کے تار بھیجے اور اپنے آٹوگراف کے ساتھ تصویریں بھی ـــ اور پھر یوں ہوا کہ سگرٹ کی ڈبیوں پر، ماچسوں کے لیبل پر، لفافوں اور پوسٹ کارڈوں پر، ٹیلی گرام اور منی آرڈر فارموں پر، پیپر ویٹ اور فونٹین پنوں پر، کوٹ، شیروانی اور سویٹر کے بڑے بڑے بٹنوں پر، دودھ کے ڈبوں اور شیشیوں پر، وزن بتانے والے ٹکٹوں پر، پاپڑ، گرم مسالوں اور دالوں کے پیکٹوں

پر، کیش میمو اور رسیدوں پر، لانڈری کے کھڑکھڑاتے ہوئے لفافوں پر، مٹھائیوں کے ڈبوں پر، لاٹری کے ٹکٹوں پر، اسپتالوں کے آؤٹ ڈور نسخوں پر، بجلی کے بلوں پر، ریڈیو، موٹر اور اسکوٹروں کے لائسنسوں پر، بینک کی پاس بکوں پر، ٹیلیفون ڈائرکٹریوں پر، ریلوے ٹائم ٹیبلوں پر۔ غرض کہ بادشاہ کی پوشاک کا بلاک ہر جگہ نمایاں روشنائی میں چھپا ہوا دکھائی دینے لگا۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ اتنی ڈھیر ساری چیزوں پر اپنی پوشاک کی کیفیت چسپاں کر سکتا ہے اس لیے اُس نے آپ کو یہ نہیں بتایا لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بادشاہ نے صرف ایسا ہی نہیں کیا بلکہ ملک کے بہترین انجینیروں، ڈاکٹروں، سائنٹسٹوں اور فلسفیوں کو اس بات کے لیے مقرر کیا کہ وہ شب و روز لیبوریٹریوں اور ریسرچ سنٹروں میں اُس کی پوشاک کی بخیہ اُدھیڑتے رہیں۔ اُس نے ایسی فلموں کے ڈائرکٹروں، پروڈیوسروں اور ایکٹروں کو انعامات دیئے جو اُس کی پوشاک کے تمام زاویوں کو پیش کر کے بچوں کے ذہنوں کی تربیت کرتے تھے، اُس نے ایسے تمام اُستادوں کو خصوصی تمغے اور نقد رقمیں عطا کیں جو تختۂ سیاہ پر اُس کی پوشاک کا خاکہ کھینچنے میں پچاسوں من کھریا مٹی صرف کر چکے تھے۔ وہ ہر سال ایسے تمام فوجی افسروں اور پولیس کے سپاہیوں کی بیواؤں کو سونے اور چاندی کے میڈل بھی تقسیم کرتا رہا جو اُس کی پوشاک کے ناموس کے تحفظ میں اپنی جانیں دے چکے تھے۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایسا کچھ ہوتے ہوئے برسوں گزر گئے اور کیونکہ تب اینڈرسن کو مرے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے اس لیے وہ یہ بتانے سے قاصر رہا

کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوا لیکن میں آپ کو اس کہانی کے آگے کی کہانی سُناتا ہوں۔
ہوا یہ کہ کئی برس بعد جب بادشاہ کو یہ یقین ہوگیا کہ اب اُس کے ملک کے
بچے عقلمند ہو چکے ہوں گے تو اُس نے اُن کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔
ایک شاندار جلوس پھر نکالا گیا۔ ہاتھی گھوڑے فوج اور بینڈ باجے کے ساتھ
بادشاہ کی سواری پھر نکلی۔ اُس روز بادشاہ نے اپنے جسم پر وہی لباس زیب تن
کیا تھا اور وہ ایک اونچے سے ہاتھی پر سوار تھا۔ چھوٹے چھوٹے لاتعداد بچے سڑک
کے دونوں طرف اُس کے استقبال کے لیے ہاتھوں میں جھنڈے لیے کھڑے تھے
اُن چھوٹے چھوٹے جھنڈوں پر بادشاہ کی پوشاک کی تصویر تھی۔ بادشاہ بہت
خوش ہوا لیکن اُس کی آنکھیں بیقراری کے ساتھ اُس مجمع میں اُس لڑکے کو تلاش
کر رہی تھیں جو کچھ عرصے پہلے اپنے دادا کے کندھے پر سوار ہو کر آیا تھا۔ بادشاہ
کی یادداشت میں اُس بچّے کی ایک ہلکی سی تصویر باقی تھی۔ جلوس دھیرے
دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ سب اُس کی پوشاک کی شان میں قصیدے پڑھ
رہے تھے۔ پورے شہر کا گشت لینے کے بعد بھی بادشاہ کو وہ بچہ نہیں دکھائی
دیا۔ ہر موڑ پر بچّے تھے لیکن جس بچّے کو اُس کی آنکھیں تلاش کر رہی تھیں وہ اُن
میں نہیں تھا۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بچّے کو
پہچان لے گا۔ اُن آنکھوں کی چمک سے پہچان لے گا جو سب سے مختلف تھی۔ بادشاہ
ایک ایک بچّے کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ بے چین ہو کر ایک ایک بچّے کی نظریں
ٹٹول رہا تھا لیکن وہ بچہ اُسے کہیں نہیں ملا۔ جلوس شام ہوتے محل واپس آگیا۔
بادشاہ بھاری دل کے ساتھ اپنی آرام گاہ میں داخل ہوا۔ وہ اپنی رانی سے بھی

نہیں ملا۔ اُس نے منادی کرادی کہ کوئی اُس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ تھکے ہارے جسم کے ساتھ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے نیند کی گولی کھا کر سو جانا چاہا لیکن اُسے نیند نہیں آئی۔ کسی بچے کی آنکھیں جیسے بار بار اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں اُس کی آنکھیں تپ رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اُس کا بدن پھنکنے لگا تھا۔ اُس نے کال بیل بجائی اور بیہوش ہوگیا۔

بادشاہ کے پرائیوٹ سکریٹری نے جب اُسے ایسی حالت میں دیکھا تو وہ دوڑ کر شاہی طبیب کو بلا لایا۔ طبیب نے بادشاہ کو غور سے دیکھا۔ بادشاہ کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

"وہ بچہ کہاں ہے؟"

طبیب گرگ جہاندیدہ تھا۔ اُس نے دیگر طبیبوں سے مشورہ کیا۔ طے پایا کہ سارے طبیب اُس بچے کی تلاش میں نکل پڑیں ورنہ بادشاہ مرجائے گا۔ سلطنت بہت بڑی تھی لیکن طبیبوں کا خیال تھا کہ شائد کسی کونے میں ایک ہی بچہ ایسا مل جائے جو بادشاہ کو اس موذی مرض سے نجات دلا سکے۔ طبیب ہزاروں بچوں سے ملے۔ اُن کا طبی معائنہ کیا گیا لیکن جس بچے کا بھی وہ معائنہ کرتے وہی بچہ جب عقلمند نکلتا تو اُن کی مایوسی اور بڑھ جاتی۔ دراصل انھیں ایک بے وقوف بچے کی تلاش تھی۔ گھوڑے ہر طرف دوڑائے گئے لیکن ہر طرف سے ناکامی کی خبر آئی۔ ہرکاروں کو پوری مملکت میں ایک بھی بچہ بے وقوف نہیں مل سکا تھا۔ ادھر بادشاہ کی حالت دن بہ روز بگڑتی جارہی تھی۔ آخر کو شاہی

طلبیوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بچے کو تیار کر کے بادشاہ کے سامنے لے جائیں جس سے ممکن ہے کہ بادشاہ کو کچھ افاقہ ہو سکے۔

ایک چھوٹے سے بچے کو بادشاہ کے لیے تیار کیا گیا۔ بچے کو بتایا گیا کہ جب وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو تو وہ بادشاہ سے کہے:

"بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

جب بچہ اس بات کو اچھی طرح رٹ چکا تو اُسے بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا، بچہ سب سے پہلے بادشاہ کے سامنے ادب سے کورنش بجالایا۔ اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر اور گردن جھکا کر فلم "پکار" کے سہراب مودی کی طرح بولا۔

"بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

یہ سن کر بادشاہ نے آنکھیں کھول کر بچے کی طرف دیکھا اور پھر وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بچے کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اُس کے چہرے کو قریب کر کے اُس کی آنکھوں میں غور سے دیکھ کر بولا۔

"ایک بار پھر تو یہی بات کہو میرے بچے۔"

بچہ پھر سہراب مودی کی طرح متانت سے بولا۔

"بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

بچے کا چہرہ سپاٹ تھا، آواز اور لہجہ سپاٹ تھا اور آنکھوں میں دُور دُور تک وہ روشنی نہیں تھی جو بادشاہ نے سڑک کے کنارے ایک بوڑھے کے کندھے پر بیٹھے ہوئے ایک بچے میں دیکھی تھی۔ اُس نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"یہ بات تمھیں کس نے بتائی بیٹے کہ میں ننگا ہوں۔"
بچّہ یہ سُن کر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ بادشاہ نے اُسے ایک شاہی چاکلیٹ دی جو اُس سے پہلے بچّے نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور پھر بڑے پیار سے بولا۔
"تم ڈرو نہیں مجھے بتا دو کہ یہ بات تمھیں کس نے بتائی' میں تمھیں بہت اچھے اچھے کھلونے دوں گا۔"
بچّہ چاکلیٹ کو تجسّس سے کھولتے ہوئے بولا۔
"مجھے تو آپ کی پوشاک بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ بات تو مجھے بڑے حکیم صاحب نے یاد کرائی تھی کہ آپ ننگے ہیں۔"
یہ سُنتے ہی بادشاہ نے یکبارگی دونوں ہاتھوں سے بچّے کا گلا پکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے پوری بربریت کے ساتھ بچّے کا گلا گھونٹ دیا۔ بچّے کی مُردہ مٹھی میں آدھی کھُلی ہوئی شاہی چاکلیٹ اب بھی دبی ہوئی تھی اور اُسی گھڑی سے بادشاہ نے اپنا وہ شاہی فرمان جاری کیا جس کی رُو سے پورے ملک میں منادی کرادی گئی کہ اب بادشاہ کی مملکت میں کسی بچّے کو بچہ ہی نہیں رہنے دیا جائے گا کیونکہ جتنا وقت' محنت اور سرمایہ ایک بچّے کو عقلمند بنانے میں لگتا ہے اُس سے کہیں کم وقت میں اور کبھی کبھی تو صرف ایک شاہی چاکلیٹ کے بدلے بچّے کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔

پھر اُس بادشاہ کی بادشاہت میں بچّوں سے اُن کا 'بچہ پن' کیسے چھین لیا گیا اور اُس بادشاہ کا مرض کیسے ٹھیک ہوا یہ بات اینڈرسن کیسے جان سکتا

تھا جب کہ یہ بات خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے کوئی بہت جلد آپ کو اس کہانی سے آگے کی وہ کہانی بھی سنائے گا جسے نہ اینڈرسن پوری کرسکا اور نہ میں۔

■

سب اکیلے ہیں

میں نے یہ درد بھی تمھارے لیے سہہ لیا ہے ۔۔!
ادھر ۔۔ میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھو ۔۔!!
(لیکن اس نے نہیں دیکھا)

دیکھو نا میری آنکھوں میں کہ اگر یہ جھوٹی ہوں گی تو اُن میں وہ صاف شفاف روشنی تمھیں نہیں ملے گی کہ جس کا جلوہ کبھی کسی پہاڑ پر آگ کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے آج سے ہزاروں سال پہلے کسی فرشتے نے دیکھا تھا۔
(لیکن اُس نے میری آنکھوں میں نہیں دیکھا۔)

میری بات سُنو کہ ہر لمحہ بہت قیمتی ہے اور ہر گزرا ہوا پل ایک جان لیوا حساب کتاب ہے کہ اگر یادوں میں کھو جائے، رک جائے، کھو جانے کا نام نہ لے تو دبی ہوئی چنگاری کے مانند، اٹکے ہوئے کانٹے کی طرح یکبارگی ایسا جلاتا ہے، ایسا کھٹکتا ہے کہ مرنے بھی نہیں دیتا اور جینے بھی نہیں دیتا
(لیکن تب بھی وہ یونہی گم سُم رہی۔)

اور وہ شام بھی گزر گئی ـــــ اُداس خالی خالی اُجڑی اُجڑی بے معنی شام۔ لڑکیاں کتنی شامیں سمیٹ کرلے جاتی ہیں اور بدلے میں کچھ نہیں ملتا۔

مرد کے لیے اس سے دلچسپ کھیل اور کیا ہوگا۔ اسے اتنا تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ دوسری شام بھی آئے گی۔

(اور دوسری شام آئی)

وہی میز۔ وہی میز پر لٹکتا ہوا روشنی کا مدھم سا دائرہ۔ وہی ہلکی ہلکی موسیقی اور پھر وہی سوچے ہوئے تراشے ہوئے گرم گرم الفاظ۔

یہ جو میں تم سے بیان کر رہا ہوں کیا تم پر کبھی گزری ہے؟

میرا مطلب ہے کہ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم نے اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں کبھی کوئی میٹھا میٹھا درد سہا ہو، کوئی الزام اپنے سر لیا ہو، اپنی ایمان دار آنکھوں میں جھانکنے کی کسی سے بھیک مانگی ہو، اپنی بات کسی کو سمجھانا چاہی ہو اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔"

(اور وہ شام بھی گزر گئی۔)

مرد کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دوسری شام بھی آئے گی۔

ـــ (اور دوسری شام آئی)

تب تک اُس کے آنسو آنکھوں سے بہہ کر گالوں سے ہوتے ہوئے ہونٹوں کے کونوں کو گیلا کر چکے تھے۔ گہری لپ اسٹک والے ہونٹ بار بار کپکپا رہے تھے۔ گلاس میں بلبلے اٹھا تا ہوا کوک یونہی ایک طرف رکھا تھا۔

پچھلی کچھ شاموں سے میں اُس لڑکی کو دفتر سے اٹھا کر لے آتا تھا۔
یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ لڑکی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جس کو برساتی یا چھتری کے مانند ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔ بعض مرد لڑکیوں کے معاملے میں بیانات دیتے وقت ایسا محسوس کرتے ہیں کہ وہ دنیا کے واحد مرد ہیں جنھیں لڑکیوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے اور جو کچھ انھیں معلوم ہے بس وہی سچ ہے۔
لیکن وہ شام۔ رخساروں پر پھسلتے ہوئے گرم گرم آنسوؤں والی وہ شام جب وہ میرے سامنے تھی۔ دُبلی پتلی، سانولی سلونی سی لمبے قد کی یہ لڑکی ایک دن اچانک بس یونہی اتنی اچھی لگی تھی کہ جی میں آیا تھا کہ اُسے چھُو کر اور محسوس کر کے دیکھوں کہ من کو بھا جانے والی ہر لڑکی ایک کائنات ہے اور ایک ان دیکھی، خوبصورت اور دلکش وادی ہے جس کی خوشبوئیں اور حرارتیں قریب آنے کی دعوت دیتی ہیں اور اُسے Explore کرنے کے لیے چیلنج کرتی ہیں۔
لیکن شامیں ایک جیسی ہوتی ہیں، سارے الفاظ دنیا کے سارے مرد دنیا کی ساری لڑکیوں کے لیے استعمال کر چکے ہیں۔ کچھ بھی تو نیا نہیں رہ گیا، لیکن وہ لڑکی جو سامنے بیٹھی تھی پچھلی کچھ شاموں سے میرے ساتھ تھی ایسی لڑکی دنیا میں کبھی پیدا نہ ہوئی تھی اور ایسی شام دنیا میں کبھی نہ آئی تھی جو اُس شام تھی۔ میرے سارے لفظ بھی نئے تھے۔ ان کہے، اچھوتے۔ جو صرف اُس لڑکی کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اُس لڑکی کے ساتھ ختم ہو جانے والے تھے۔

میں نے دیکھا وہ جیسے اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ اتنی بہادری سے کہ اس کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا اُس کا باہر پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شائد یوں پتھر کی مورت بن کر بس آنسوؤں کے تار بہانے تک موقوف نہ رہتا۔ شائد کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو ــــ

یک بارگی وہ روتے میں مسکرائی۔

"بس اسی لیے مجھے یہاں لاتے ہو۔"

یہ کہہ کر اُس نے میری سگریٹ کی ڈبیا اپنی طرف کھینچی، ایک سگریٹ نکالا ہونٹوں سے لگا کر جلایا اور ایک گہرا سا دھوئیں کا مرغولا میرے اور اُس کے درمیان ہوا میں تیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔

"میں تمھیں اچھی لگتی ہوں ــــ ؟"

"میرا خیال ہے یہ ایک غیر ضروری سوال ہے۔"

"کیوں ــ ؟" وہ بولی۔ "غیر ضروری کیوں ــ ؟"

"اس لیے کہ تم مجھے ادھر کافی دنوں سے اچھی لگ رہی ہو اور یہ بات تمھیں بھی معلوم ہے۔"

"مجھے کیسے معلوم ہے ؟" وہ قدرے حیرت سے بولی۔

"اس لیے کہ جب کسی لڑکے کو کوئی لڑکی اچھی لگنے لگتی ہے تو لڑکے کے نہ بتانے پر بھی لڑکی سے یہ بات چھپی نہیں رہتی۔"

وہ میرے جواب پر کچھ نہیں بولی۔ اس لیے کہ بولنا بیکار تھا۔ اس لیے کہ اب تک جو کچھ وہ بولی تھی بس عادتاً بولی تھی کہ لفظ سارے کے سارے پرانے

ہو چکے ہیں۔ اُن کی خوشبو، اُن کی گرمی اور تازگی نہ جانے کہاں کھو چکی ہے۔ ایسی صورت میں باہر کچھ بھی ہو کیسا بھی ہو، آدمی واپس اپنے اندر چلا جاتا ہے۔ جب لفظ بے کار ہو جاتے ہیں تو جذبے سرد پڑ جاتے ہیں اور جب جذبے سرد پڑ جائیں تو ہر چیز اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔ نہ کچھ آشکار ہوتا ہے اور نہ کچھ آشکار کیا جا سکتا ہے اور جب کچھ منکشف نہیں ہوتا تو جوانی ہو یا بڑھاپا، سردی ہو یا گرمی، شہر ہو یا گاؤں کچھ اچھا نہیں لگتا۔

وہ بار بار اپنی انگلیوں میں پھنسی سگریٹ سے کھیل رہی تھی۔ جلتی ہوئی سگریٹ بڑے کام کی چیز ہے۔ شائد سگریٹ کی موجودگی میں اُسے استعمال کرنے والے کو ہر دم یہ احساس رہتا ہے جیسے وہ تنہا نہیں ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی کسی کام میں مصروف ہے۔ دھیرے دھیرے جلنے کے کام میں۔ آہستہ آہستہ کم ہونے اور ختم ہونے کے عمل میں۔ اور کتنی طمانیت ہوتی ہے اس احساس سے ۔۔۔! وہ ابھی مطمئن سی نظر آرہی تھی جیسے میرے اور اُس کے علاوہ وہاں کوئی تیسرا بھی موجود ہو اور جس کی مدد لے کر وہ جب چاہے مجھے کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر سکتی ہے۔ اور زندگی میں کبھی کبھی دوسرے کو نظر انداز کر دینے کی فطری ضرورت ہر ایک کو پڑتی ہے ورنہ شائد زندگی اور بھی مشکل ہو جائے۔

"تم نے کہا۔ 'جب کسی لڑکے کو کوئی لڑکی اچھی لگنے لگے'۔۔۔ تو کیا تم اب بھی اپنے کو لڑکا سمجھتے ہو؟"

"ہاں اتنی عمر تو ہے ابھی میری کہ کسی لڑکی کے دل میں ہیجان پیدا کر سکوں۔"

— یہ کہہ کر ایک تیکھی نظر سے میں نے اُسے دیکھا۔

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"یہی کہ تم مجھے اچھی لگنے والی ایک اسمارٹ سی سانولی سلونی لڑکی ہو جو دفتر میں ہر وقت چہکا کرتی ہے۔"

"اور کیا جانتے ہو —؟"

"اور تو کچھ نہیں۔"

"کیا تمھیں اپنے بارے میں یہ غلط فہمی بھی ہے کہ کوئی بھی لڑکی جس کو تم چاہو تمھاری طرف کھنچ سکتی ہے اور تم اُس کے اندر ہیجان پیدا کر سکتے ہو؟"

"غلط فہمی کی بات تو میں نہیں جانتا، بہرحال میں مرد ہوں۔"

"پھر اُس کے بعد —؟ اُس نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کے بعد کیا —؟"

"میرا مطلب ہے اس کے بعد تم کیا کر سکتے ہو؟"

اس سوال پر میں اُسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک دم زور سے ہنسی اور بولی۔

"اُس کے بعد تم کتے کی طرح لڑکی کے آگے پیچھے دم ہلانے لگتے ہو گے اور بہرحال فیصلہ اُس لڑکی کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہوگا کہ وہ تمھیں دھتکار دے یا تمھاری کنگال جھولی میں ان لمحوں کی تھوڑی سی بھیک ڈال دے جو لمحے دبی ہوئی چنگاری کے مانند اور اٹکے ہوئے کانٹے کی طرح ایسا جلاتے ہیں اور ایسا

کھٹکتے ہیں کہ مرنے بھی نہیں دیتے اور جینے بھی نہیں دیتے۔"
یہ کہہ کر اس نے کوک کا دیر سے رکھا ہوا گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور ایک سانس میں پی گئی۔
"تم بہت انٹریسٹنگ ہو، بہت دلچسپ۔" میں نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر بات آگے بڑھانا چاہی ــــ میں جانتا تھا کہ وہ لمحات بڑے قیمتی تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے جب لڑکیاں اپنے ذہن پر زور دے کر اپنے کو کھو دینے کے مشغلے میں دلچسپی لیتی ہیں اور جب وہ اس منزل پر آگئی تھی تو میں اس لمحے کو کھونا نہیں چاہ رہا تھا۔
"جو کچھ تم کہہ رہی ہو کیا یہ تمھارا تجربہ ہے یا مشاہدہ ہے یا پھر محض کتابوں میں پڑھی ہوئی باتیں ہیں۔"
"ایک بات بتاؤ گے؟" اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے خود سوال جڑ دیا۔
"بولو ــ" میں نے اُسے موقع دیا۔
"تم مجھے دفتر میں دیکھتے تھے۔"
"ہاں ــ"
"ہنستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے، لوگوں کا مذاق اُڑاتے۔"
"ہاں!"
"روز روز بھڑکیلے لباس پہن کر آنا، رخساروں، ہونٹوں، بھوؤں اور آنکھوں کو جاذبِ نظر بنا کر جسم کے دلنواز خطوط سے لبھانا، کچھ چھپانا، کچھ

دکھانا، سیرابی اور تشنگی کی ایسی دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلنا جو مرنے بھی نہ دے اور جینے بھی نہ دے۔ یہاں تک کہ تمھارا میرے لیے یوں پاگل ہو جانا کہ میرے سوا تمھیں کچھ دکھائی نہ دے۔ کب سے تم میرے آگے پیچھے گھوم رہے ہو، کب سے تم چپکے چپکے بے آواز بھیک مانگ رہے ہو، یہاں اس رسٹوران میں لے کر آتے ہو۔ کبھی بھی تمھارا سر میرے قدموں میں ہو سکتا ہے، اب تم ہی بتاؤ، ہیجان کہاں پیدا ہوا۔ کس کے دل میں؟ میرے یا تمھارے اور کس نے پیدا کیا؟ میں نے یا تم نے؟"

"تم نے ـــ" بڑی متانت سے میں نے اُس کی طرف یوں دیکھا کہ وہ میرے احساسِ شکست کو آسانی سے پہچان لے۔ اپنی کمتری اور بے بسی کا اظہار جس میں مرد کا وہ بنیادی گھٹیا پن شامل تھا جس کے سہارے وہ اکثر اس کھیل میں انجام کار ایک فاتح کی طرح اُبھرتا ہے۔

یہی ہوا بھی۔ وہ کچھ نرم پڑ گئی۔ مرد کو جھکتے دیکھ کر اُسے کچھ اچھا لگا تھا، آرام سا ملا تھا۔ اس آرام کا بھی ایک مزہ ہے۔ یہ مزہ صرف مرد ہی کسی لڑکی کو دے سکتا ہے۔ اس مزے میں ایک نشہ ہوتا ہے اور یہ نشہ ہر لڑکی کو اچھا لگتا ہے۔ مگر اس نشے کی بھی ایک مقدار مقرر ہے جسے عام طور پر مرد نہیں جانتے۔ یہ مقدار سب کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس لڑکی کو مدہوش ہونے کے لیے کتنی مقدار کی ضرورت تھی۔

بس اُسے ایک ہلکی سی لہر آئی اور وہ سنبھل گئی۔ سنبھلی تو اُداس ہو گئی۔

"میری عمر ۲۳ سال ہے۔" اُس نے بات شروع کی۔ "پچھلے تین سالوں

میں کئی لڑکوں کے دلوں میں ہیجان پیدا کر چکی ہوں میں۔ ایک لڑکا مجھے بھی مار گیا۔ تمھیں اُس کی تصویر دکھاؤں گی۔ بہت خوبصورت۔ گورا چِٹا۔ اُس نے بڑی تیزی سے محبت کی مجھ سے۔ جھیلوں کے کنارے، سائے دار کُنجوں میں، سنیما گھروں، رسٹورانوں اور پارکوں میں ہم ملے۔ میں گلے گلے اُتر گئی اُس کی محبت میں۔ جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ اُس کی محبت کا پودا بڑا ہوا، اُس میں شاخیں آئیں، برگ و بار آئے اور پھر وہ درخت اپنی موت مر گیا۔ ہر درخت پھول پتیاں دے کر سوکھ جاتا ہے۔ اُس نے میرے ہونٹ چومے، اس طرح کہ میں قطرہ قطرہ بہہ گئی۔ اس طرح میرا انگ انگ چوم ڈالا کہ میرا دماغ ہی نہیں میری کوکھ بھی سوچنے اور محسوس کرنے کا کام کرنے لگی ہے اور اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ عورت اپنی کوکھ سے بھی سوچتی ہے۔ میری بات یاد رکھنا۔ گلے گلے پیار کے ساگر میں اُتر جانے کے بعد بھی فیصلہ عورت ہی کرتی ہے، کب جب وہ کوکھ سے سوچنے لگے ـــ اور پھر میں نے ایک دن فیصلہ کر لیا۔ ـــ"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اُس دن مجھے وہ ساری لڑکیاں ایک ایک کر کے یاد آگئیں جو اپنی اپنی جگہ ایک کائنات تھیں۔ اور مجھے اُن کائناتوں میں کچھ دیر جینے اور سانس لینے کا موقع مل چکا تھا۔ اُن سب سے مجھے کیا ملا اور کتنا ملا؟

اور تب مجھے ایک بار پھر اس غلط فہمی کا احساس ہوا تھا۔ اُس خود فریبی کا احساس کہ جس میں مجھ جیسے مرد مبتلا رہتے ہیں۔ کیا میں ان میں سے کسی بھی ایک لڑکی سے کچھ پا سکا تھا۔ آخر میرے حق میں اُن کے کیے ہوئے فیصلے کیا

تھے ؟ یعنی جب اُن کے دماغ کے ساتھ اُن کی کوکھ بھی سوچنے لگی تو پھر میرا انجام کیا ہوا ــ ؟ عورت ایسا کیوں کرتی ہے ؟ وہ صرف دماغ سے کیوں نہیں سوچتی ؟ پیٹ سے کیوں سوچنے لگتی ہے ؟ جب مرد کو محبت کے کھیل کا اختیار ہے تو پھر اس کھیل میں فتح یا شکست کا فیصلہ بھی وہ خود کیوں نہیں کرسکتا ؟

"سُنو" اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ اب وہ دوسری سگریٹ جلا چکی تھی۔ "تم نے مجھ سے سوال نہیں کیا ؟"

"کیسا سوال ؟"

"یہی کہ میں نے کیا فیصلہ کیا تھا ؟ اور اس محبت کے کھیل کا انجام کیا ہوا ؟"

"کوئی ضرورت نہیں اس انجام کو بتانے کی ۔" ــ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"کیا تم اس انجام سے واقف ہو ؟ یا تمھیں دلچسپی ہی نہیں اسے جاننے کی ۔"

"میں انجام سے واقف ہوں !" یہ کہہ کر میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تم نے اُس کے سامنے شادی کی بات رکھی ہوگی اور اُس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی ہوگی، آنا کانی کی ہوگی، وقت مانگا ہوگا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا ہوگا ؟ اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے اس کی صرف ایک ہی وجہ رہی ہو، ایک ہی وجہ ہوتی ہو کہ تم اپنی کوکھ سے مجبور ہو۔ اُس میں اُٹھنے والے طوفان تمھارے بادبانوں کے رُخ موڑ دیتے ہوں اور یہ کام گیلیلیو کے

بس کا نہیں تھا۔ اُس پر جو کچھ منکشف ہوا تھا وہ حتمی تھا، کیونکہ کوکھ اور دماغ میں بھی فرق ہے۔ تم نے آخرکار اس لڑکے سے بے رُخی برتنا شروع کر دی ہوگی اور پھر ایک دن اُسے سختی سے منع کر دیا ہوگا کہ وہ تم سے نہ ملے لیکن کچھ دن وہ پھر بھی تمھارے ارد گرد چکر کاٹتا رہا ہوگا۔ مگر تم اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہی ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ آہستہ آہستہ تمھیں بھلانے میں کامیاب ہوگیا ہوگا۔ اس طرح تم جیت گئیں اور وہ ہار گیا ہوگا۔ یہی نا؟"

"ہاں وہ ہار گیا ۔" وہ بولی ۔۔۔ "لیکن یہ الگ بات ہے کہ میں آج بھی اُس کی محبت میں پھنک رہی ہوں۔ آج اس وقت، ابھی وہ میرے سامنے آجائے تو اُسے اپنی بانہوں میں لے کر اتنے پیار کروں، اتنے پیار کروں ۔۔۔ بٹ آئی ہیٹ ہم۔ مجھے اُس سے نفرت ہے۔ اس کے آگے وہ اپنے اوپر قابو نہ پا سکی، میز پر دونوں کہنیاں رکھے اور دونوں سے اپنا چہرہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اُسے اس طرح روتے دیکھ کر میرا سارا وجود مجھ سے نکل کر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا اور مجھے لگا کہ اُس لڑکی کے سامنے صرف ایک مرد بیٹھا تھا۔ ایک تشنہ کام اور بہت اکیلا سا مرد جو سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکیاں جن سے وہ پچھلے برسوں میں محبت کا کھیل کھیل چکا تھا اُن میں سے کوئی ایک لڑکی کسی جگہ اسی طرح دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے اُس کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہوگی اور اُس کے سامنے بھی بیٹھا ہوا کوئی مرد تشنہ کام اور بے حد اکیلا ہو چکا ہوگا۔

حصّہ دوم

دشتِ معنی

مُدافعت

آنکھوں میں
ناک میں
پھیپھڑوں میں
سانسوں میں
دھواں ہی دھواں تھا
اور وہ سب زمین پکڑے لیٹے تھے۔
ہوا خاموش تھی اس لیے دھواں زیادہ تھا۔ ساکت ہوا میں دھواں اُڑ کر بکھر نہیں پاتا۔
تمام سمتوں سے دھوئیں کے بادل آرہے تھے۔
ایک مکان میں آگ لگ گئی تھی۔ اور وہ سب آگ بجھانے دوڑ پڑے تھے
وہ باخبر لوگ تھے۔ آگ، اُس کی ہلاکت خیزی اور آگ کی نوعیتوں کے بارے میں بڑی معلومات تھیں اُنھیں۔

مکان کے اندر پہنچنے کے لیے صرف بلندی پر ایک کھڑکی انھیں کھلی نظر آئی۔

سیڑھی لگا کر وہ اُس کھڑکی تک پہنچے۔ دھویں کے پر قاست مرغولے کھڑکی کے راستے باہر نکل رہے تھے جو سب سے آگے تھا اُس نے پانی پھینکنے والا پائپ پکڑ رکھا تھا۔ آخر اُس نے پانی کا نشانہ سادھا اور کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر موٹی سی تیز دھار کو پھینکنا شروع کیا۔ یہ دھار بڑی سفاک تھی۔

اندر کیا ہے نہ تو اُس آدمی کو معلوم تھا جو سب سے آگے تھا اور نہ اُنھیں جو سب سے پیچھے تھے۔ آگ کس چیز میں لگی ہے۔

یہ سوال اُن سب لوگوں کے لیے بہت اہم تھا جنھیں آگ بجھانا تھی۔

آگے والا پانی کی دھار سے دھویں کے بادلوں کو کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اندر جھانکنا چاہتا تھا۔ وہ جتنے دھویں کے پہاڑ دھار سے کاٹتا اتنے ہی پہاڑ اور سامنے آجاتے۔

نیچے لوگ بڑھ رہے تھے۔ یہ لوگ دیکھنے میں مشغول تھے، صرف دیکھنے میں۔

تب سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے لوگ کھڑکی کے ذریعے کمرے کے اندر کود گئے۔

اندر اُنھیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرہ دھویں کی گیند ہو رہا تھا پیر کمرے کے گیلے فرش کو محسوس کر رہے تھے۔ اُن سب کو لگا کہ دھواں اُن کے نتھنوں میں بھر رہا ہے۔ ہر سانس میں ہوا کے بجائے وہ دھواں نگل رہے تھے۔ دھواں بھری آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور تب جو سب سے آگے تھا وہ جلدی سے کمرے کے فرش پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ مدافعت کا یہ سب سے پہلا اصول ہے

جب دھویں میں گھر جاؤ تو فوراً زمین پکڑ لو۔
دھواں ہمیشہ نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے۔
کھڑے رہنے کی حالت میں دم جلدی گھٹ جائے گا۔
اس لیے۔ زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ جاؤ۔
سینہ بالکل زمین سے چپکا لو۔
اُن سب نے اپنے اگلے ساتھی کی طرح اوندھے ہو کر زمین پکڑ لی
کافی دیر زمین پکڑے پکڑے اُن میں سے ایک قدرے بے چین ہو گیا
اُس نے چپکے سے آگے والے سے کہا۔
"اب کیا کرنا چاہیئے؟"
"ہمیں دھویں سے اپنے کو بچانا چاہیئے۔" اُسے جواب ملا۔
کیوں کہ اُس نے بے چین ہونا شروع کر دیا تھا اس لیے اُس آدمی کی بے چینی بڑھتی گئی۔
وہ گردن اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ دھواں اُس کی آنکھوں میں بھرنے لگا۔ اُس بے چین آدمی نے جلدی سے اپنا ماتھا زمین پر ٹکا دیا۔ تھوڑا توقف کر کے وہ زمین پکڑے پکڑے اپنے آگے کی سمت رینگنے لگا وہ مشکل سے ایک ڈیڑھ فٹ آگے رینگ پایا ہو گا کہ دھویں سے اُس کا دَم گھٹنے لگا۔ اب وہ آگے والے کے برابر آ چکا تھا۔
"میرا دم گھٹ رہا ہے۔" وہ برابر والے سے چپکے سے بولا۔
اُسے مشورہ دیا گیا کہ وہ اور آگے نہ بڑھے اور مُنھ پر ڈھاٹا کس لے کیوں کہ

سب ہی ایسا کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اُس نے ناک پر ڈھاٹا لگا کر ایک زوردار آواز لگائی۔

"کیا یہاں کوئی ہے۔"

دھویں بھری خاموشی میں وہ جواب میں کوئی آواز نہ سُن سکا۔ ہاں مُنہ کھولنے پر دھواں اُس کے پھیپھڑوں میں گھس گیا اور اُسے زوردار کھانسی آگئی۔ وہ اپنی کھانسی پر جب قابو پا چکا تو اُس نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا لیکن اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اب وہ ایک بار پھر آگے کی طرف رینگنے لگا۔ اور بھی سب چیونٹیوں کی طرح آگے رینگ رہے تھے۔

اُنھیں یہ بھی نہیں معلوم تھا جس کمرے میں وہ ہیں اُس کا طول اور عرض کیا ہے۔ وہ برابر زمین کو اپنے دائیں اور بائیں ٹٹول رہے تھے۔

"یہ آگ کدھر سلگ رہی ہے؟" زمین سے چمٹے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے سوال کیا۔

"داہنی طرف" ایک آواز آئی۔

"نہیں بائیں طرف"۔ دوسری آواز نے کہا۔

اور تب ہی اُنھیں آگ بجھانے کے وہ اُصول یاد آئے۔ آگ سے بچنے کی دو صورتیں ہیں۔

آگ کو آکسیجن مت فراہم ہونے دو۔

وہ سامان ہٹا دو جو فوراً آگ پکڑتا ہے۔

لیکن جس صورتِ حال سے وہ گزر رہے تھے وہ خاصی پریشان کُن تھی۔

اگر شعلے نکل رہے ہوتے، جلتی لکڑیاں چٹخ رہی ہوتیں تو یہ لڑائی کتنی آسان ہو جاتی۔ پانی کی دھار دھوئیں کے لیے بے کار ثابت ہو چکی تھی۔ اُن کے لیے دم گھٹا دینے والا دھواں چاہے داہنی سمت سے ہو یا بائیں سمت سے اُسے روکنا بے حد ضروری تھا۔ وہ یہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ جب تک دھواں اُن کے سروں پر ہے وہ اوپر نہیں اُٹھ سکتے۔ اور وہ اوپر اُٹھنا چاہتے تھے۔

"کیا تم کسی نتیجے پر پہنچے ـــ؟" پیچھے والے نے آگے والے سے سوال کیا۔

"ہاں۔" وہ اپنی ناک پونچھتے ہوئے بولا۔ "یہ کہ اس دھوئیں سے ہمیں اپنے کو بچانا چاہیئے۔" وہ جو بہت دیر سے بے چین تھا اس جواب کو سُن کر جھنجھلا گیا۔

"تب تک بچانا چاہیئے جب تک یہ دھواں ہے۔"

"تو کیا ہم یونہی زمین پکڑے لیٹے رہیں۔"

"مدافعت کے لیے یہی ضروری ہے۔"

اور تب پیچھے والوں کو پھر یاد آیا کہ دھواں آگ سے زیادہ خطرناک شے ہے۔ دھواں بے بس کر دینے والی چیز ہے۔ دھواں جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے۔ سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ سب گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔

سب کھانس رہے تھے۔ ناک سے پانی بہا رہے تھے۔ گھُٹی ہوئی سانسوں نے سب کے گلوں کی رگوں کو پھلا دیا تھا۔ اس صورت حال سے جو سب سے زیادہ پریشان تھا وہ پھر بولا۔

"یا تو آگے بڑھو یا پھر کھڑکی کے راستے واپس لوٹ جاؤ۔"

اُس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا اور اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس

کی پُشت پر دیوار میں ایک کھڑکی اور دکھائی دی جو بند تھی۔ یہ کھڑکی اُس کھڑکی کے داہنی طرف تھی جس سے وہ لوگ اندر آئے تھے۔

اُس نے اپنے برابر والے سے کہا۔

"ہم سب اندھے ہو گئے ہیں کیا؟ ابھی ایک کھڑکی بند ہے۔ میں اُسے بھی کھولے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا جھپٹا اور دیوار پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی سانس روک لی۔ بند آنکھوں سے وہ کھڑکی میں لگی سٹکنی کو ٹٹولنے لگا۔ ذرا سی دیر میں سٹکنی اُس کے ہاتھ آگئی۔ وہ اب بھی سانس روکے تھا اور سٹکنی پر اپنا پورا زور آزما رہا تھا۔ جیسے برسوں سے اسے کبھی کھولا نہ گیا ہو۔ اُس کا دل سانس روکے رہنے کی وجہ سے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُس کا کلیجہ باہر آجائے گا۔ وہ جلدی جلدی زور لگانے لگا۔ سٹکنی میں زرا سی حرکت ہوئی۔ اب اُسے لگا کہ اُس میں سانس روکے رہنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ اُس کا دم چھوٹنے لگا تھا' طاقت جواب دے رہی تھی' ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اُس نے ایک آخری کوشش کی' دانت بھینچ کر زور لگایا۔ اس بار سٹکنی گھوم گئی اور نیچے اُتر آئی۔ اُس نے پاگلوں کی طرح اُسے اس طاقت سے اپنی طرف کھینچا جو کسی کا دم نکلتے وقت اُس کے جسم میں ایسے آجاتی ہے۔ دونوں پٹ یک بارگی کھل گئے۔ تازہ ہوا کا جیتا جاگتا جھونکا اُس سے ٹکرایا۔ اُس کی سانسیں فوارے کی طرح چھوٹ پڑیں۔ اس کے بعد کیا ہوا اُسے یاد نہیں۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ اس کھڑکی کے قریب ہی

زمین پر اوندھا پڑا ہے اور اُس کے چہرے پر پسینہ ہے۔ اُس نے دھیرے دھیرے اپنے ہاتھوں میں حرکت پیدا کی اور اپنے آس پاس ٹٹولنے لگا۔ کوئی اُس کے قریب ہی کمرے کے فرش پر زمین سے چپکا پڑا تھا۔ اُس نے کہا۔

"دیکھو میں نے دوسری کھڑکی بھی کھول دی ہے"

برابر والا جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اُس کی تھکی تھکی سانسوں کی آوازیں البتہ کانوں میں سُنائی دے رہی تھیں۔ تب اُس نے پھر کہا۔

"سُنا نہیں تم نے۔ اب دھواں دوسری کھڑکی کے راستے بھی باہر نکل رہا ہے۔"

"نہیں اب دھواں پہلے سے اور زیادہ آ بھی رہا ہے۔"

اُس نے دیکھا واقعی دھویں کی تہیں اور موٹی ہو گئی تھیں۔ کمرہ جیسے سکڑ کر اور چھوٹا ہو گیا تھا۔

وہ رینگ کر اپنے دوسرے ساتھی کے قریب گیا اور بولا۔

"کیا اس طرح پڑے پڑے تمہارا دم نہیں گھٹ رہا ہے؟"

"نہیں: اُس کا ساتھی بولا۔ " دم تو اُٹھ کر کھڑے ہونے میں گھٹتا ہے۔"

اُس نے پھر سوال کیا۔

"کیا تمہارے پھیپھڑوں میں دھواں نہیں گھس رہا ہے؟"

"میرے پھیپھڑے پہلے کے مقابلے میں اب دھویں کے کچھ عادی ہو گئے ہیں۔"

وہ اس جواب پر تڑپ اُٹھا۔ اپنے بائیں طرف گھوما اور وہاں پر چپکے ہوئے جوان سے بولا۔

"کیا تم بھی یونہی ہاتھ ٹیکے پڑے رہو گے؟"

اُس جوان نے جواب میں اُسے بتایا کہ اُس کے دو ہاتھ آگے ایک دروازہ ہے اور وہ اُس دروازے تک پہنچ بھی گیا تھا، اُسے کھولنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ اپنے دم کو روک نہیں سکا۔

یہ خبر پاکر کہ دو ہاتھ کی دوری پر ایک دروازہ ہے جو کھولا جا سکتا ہے ہاتھ بڑھایا تو واقعی اُس کا ہاتھ ایک دروازے سے ٹکرایا۔ وہ جوش میں کچھ سوچے سمجھے بغیر کھڑا ہو گیا۔ آہنی سٹکنی پر وہ پوری طرح جھول گیا۔ اپنی ساری قوت یکجا کر کے وہ دروازہ کھولنے لگ گیا۔ یکبارگی اُس کا دم چھوٹ گیا۔ کھانسی کا بھیانک دورہ اُسے دہرا کیے دے رہا تھا لیکن اُس نے سٹکنی نہیں چھوڑی۔ اُسے لگا کہ اُس کا دم نکل جائے گا۔ لیکن وہ سٹکنی سے لڑتا رہا۔ اُسے جیسے یقین تھا کہ یہ دروازہ کھلتے ہی کمرے کا سارا دھواں دو پلوں میں ہوا اُڑا لے جائے گی اور وہ تازہ ہوا میں سانس لے سکے گا۔ وہ دروازہ اُسے نجات کی آخری راہ نظر آ رہا تھا۔ کھانسی اُسے بے حال بنا چکی تھی۔ دھویں کی بے تحاشہ بو اُس کے پھیپھڑوں کو تار تار کر چکی تھی لیکن وہ سٹکنی سے چمٹا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی اُنگلیاں شاید زخمی ہو گئی تھیں اور تب ہی جانے کس لمحے وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن جب دونوں پٹ کھلے تو اُس نے دیکھا وہ ایک دوسرا کمرہ تھا جہاں دھویں کے مرغولوں کے زبردست پہاڑ اُس کی طرف بڑھنے کے لیے نہ جانے کب سے تیار کھڑے تھے۔ وہ گھٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ چیخا۔

"مجھے تازہ ہوا چاہیے۔"

"تازہ ہوا!" ــــ دھیرے سے آواز آئی۔

"جہاں بھی ہو مجھے تازہ ہوا چاہیئے۔ میں اس دھوئیں میں نہیں رہ سکتا۔"

"وہ تو تمھیں رہنا پڑے گا۔" اُسے ٹوکا گیا۔

"لیکن کیوں رہنا پڑے گا؟"

اُسے جواب ملا۔

"اپنی مدافعت کے لیے۔"

وہ ان سب سے کہنا چاہتا تھا۔

"کیا یہاں کوئی ایسا دروازہ نہیں جس کے کھولنے سے تازہ ہوا آسکے؟"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تم اور سب مل کر کھڑے ہو جائیں۔"

"یہ زمین چھوڑ کر آگے بڑھیں۔"

دیواروں پر نئے روشن دانوں کو تلاش کریں۔"

اگر دھواں ہمیں کھڑا نہیں ہونے دیتا تو آؤ ہم سب رینگ رینگ کر آگے بڑھیں۔

اُس کے ساتھی نے پوچھا۔

"تمھاری داہنی طرف کیا ہے؟"

"دھواں ــــ!"

"بائیں طرف ــ؟"

"دھواں ــــ"

"تمھارے اوپر کیا مسلط ہے؟"

"دھواں ـــ"

"اس لیے نیچے دبکے پڑے رہو کیوں کہ سب سے کم دھواں نیچے ہی ہے۔"

"لیکن یہ تو جبر ہے۔"

"ہاں اور جبر کے حالات میں زمین پکڑ کر پڑے رہنا ہی مدافعت ہے۔"

"لیکن یہ تو بزدلی ہے۔"

"نہیں یہ مدافعت ہے۔"

"مدافعت ... دم گھٹا دینے والے حالات میں جان دینے سے بہتر مدافعت تو کھلی ہواؤں میں جان دینا ہے" ـــ وہ اپنی تمام قوت کو یکجا کر کے فرش چھوڑ کر پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔ دھویں میں ہاتھ پیر مار کر ڈگمگاتے قدموں سے چل کر وہ اس کھڑکی تک آیا جو انھیں کمرے کے اندر لائی تھی اور کھڑکی کے نیچے پھاند گیا۔

○

اس لاش کو نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے گھیر لیا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہے تھے، بھیڑ میں سے کوئی بولا

"یہ آدمی تو اپنے آدمیوں میں سے نہیں ہے ـــ"

کسی نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں ـــ یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

○

اوپر کے دھوئیں بھرے کمرے میں کیا ہوا؟ اُس صورت حال میں دھوئیں سے مدافعت کرتے کرتے کون کس طرح مرا یہ ایک لمبا قصہ ہے اور غیر دلچسپ بھی، کیوں کہ اُن کی موت صرف ایک قصّہ تک ہی محدود رہی۔ کسی کے مشاہدے میں نہ آئی اور معاملات مرجانے میں نہیں مر کر دکھانے میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ہائی وے پر ایک درخت

گردن میں پھندا سخت ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے کے لیے زور لگانے لگی تھیں۔ منھ کا لعاب جھاگ بن کر ہونٹوں کے کونوں پر جمنے لگا تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان چند لمحوں کا فاصلہ اب باقی رہ گیا تھا۔ دم نکلنے سے پہلے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس نے شاخ کو دیکھا جس میں وہ لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ ہرا بھرا نیا نیا جوان ہوا ایک درخت تھا۔ سڈول تنا، گھنی گھنی اُجلی اُجلی پتیاں۔ لچکیلی اور شاداب شاخیں۔

جس وقت اُس کا بھاری بھرکم جسم شاخ میں لٹکایا گیا تھا اور اُس کے بوجھ سے شاخ ہوا میں اوپر نیچے جھولی تھی اور اُس کا لٹکا ہوا جسم رسّی کے سہارے اوپر نیچے ہوا تھا اور تلوے ایک بار زمین سے چھو گئے تھے تو اُس کے کانوں میں درخت کی شاخ سے ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز سُنائی دی تھی۔

جن قزّاقوں نے اُسے لٹکایا تھا وہ سب اپنے تنومند اور مچلتے ہوئے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر اپنے راستے پر ہو لیے تھے۔ اُس نے اُبلتی ہوئی آنکھوں سے

گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑتی ہوئی گرد کو ایک پل کے لیے دیکھا تھا اور پھر اُسے جھکتی ہوئی شاخ کی چرچراہٹ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اُس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے جن میں ابھی بصارت کی آخری کرن باقی تھی اُس جھولتی ہوئی شاخ کو دیکھا تھا۔ شاخ بہت موٹی نہ تھی اور اُس کی لچک سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اُس کے بوجھ کے پہلے جھٹکے پر کچھ چوٹ کھا گئی ہو۔ وہ اس طرح جھول رہی تھی جیسے اب ٹوٹی اور تب ٹوٹی۔ لیکن دماغ کے کسی گوشے میں وہ اس بات سے بھی باخبر تھا کہ چوٹ کھائی ہوئی شاخ زم تھی گیلی تھی۔ اُس کی تازگی کے سبب شاخ کے سارے ریشے، ریشم کے دھاگوں کی طرح آپس میں مل کر مضبوط ہو چکے تھے۔ اگر وہ شاخ سوکھی ہوتی تو ریشے جگہ چھوڑ دیتے، لچکتے نہیں ٹوٹ جاتے۔ در حقیقت صرف اتنی تھی کہ شاخ صرف اُس کے جسم کے ساتھ جھول رہی تھی۔

وہ سب اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر دکھائی دے پھر فرار ہو چکے تھے اور درخت سے کچھ ہی فاصلے پر حدِّ نظر تک لیٹی ہوئی پکی چمکیلی اور سیاہ ہائی وے سنسان پڑی تھی۔

درخت کے پرے، کچھ ہی فاصلے پر وہ رہتا تھا۔ قزاقوں نے اس پر حملہ کیا تھا جس کا اُس آدمی نے خاصہ مقابلہ کیا تھا۔ بلکہ ایک کے مُنہ پر اُس نے تھوک بھی دیا تھا۔ آخر کار جب وہ بے بس ہو گیا تو اُس نے ہاتھ پیر ڈال دیے۔ جب قزاقوں نے اس کی تلاشی لی تو انھیں یہ دیکھ کر شدید غصہ آیا کہ اس کے پاس اُن کے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جس قزاق کے مُنہ پر تھوکا گیا تھا وہ سب کا سردار تھا۔ سردار نے اُسے سر کے بال پکڑ کر گھسیٹا اور ایک قزاق سے کہا۔

"حرامزادے کے پاس نکلا بھی کچھ نہیں، لٹکادو کم بخت کو۔"

پھر اُس نے دیکھا کہ اُن میں سے ایک نے بڑے آرام سے۔ زمین پر کھڑے کھڑے بڑی آسانی کے ساتھ درخت کی ایک شاخ پر رسّی پھندا دی اور پھر اُس کی گردن کو رسّی کے ایک سرے میں پھنسا کر دوسرے سرے کو کھینچ لیا اور درخت کے تنے سے باندھ دیا۔

گھٹے ہوئے گلے کے ساتھ اُس کی باہر نکلی ہوئی آنکھوں میں بصیرت کی جو آخری کرن باقی تھی اُس کے سہارے اُس نے مرنے سے پہلے بہت کچھ دیکھ لیا۔

بس وہ پل ـــ آخری کرن کے ڈوبنے سے پہلے کا لمحہ۔

اُس پل جب وہ لچکتی ہوئی شاخ کے چرچرا کر ٹوٹ جانے کی ایک ہلکی سی اُمید لیے اُس پر آنکھیں ٹکائے تھا۔ اُسے وہ دن یاد آیا جب وہ درخت ایک ننھا سا پودا تھا۔ اُس پودے کی تازگی، اُس کا بے زور سا خوبصورت اور معصوم وجود، وہ بھی ایک بھاری بھرکم اور لحیم شحیم سڑک کے کنارے۔ اُس وقت اُس پودے کی اونچائی مشکل سے اُس کے گھٹنوں سے تھوڑا نیچے ہی رہی ہوگی۔ وہ ایک لمحہ اُس پودے کے قریب ٹھہر گیا تھا اور پیار سے اس تر و تازہ ننھے سے خودرو پودے کو دیکھتا رہا تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ یہ ننھا سا پودا ہائی وے کے اس قدر قریب اُگا ہے کہ کسی بھی بھاری بھرکم ٹرک، لاری یا جیپ کے پہیے کی زد میں آ کر کچل سکتا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ ابھی تک یہ پودا کس طرح سڑک کے نیچے اُتر جانے والے پہیوں کی زد سے بچا رہا۔ کسی چرند نے بھی اُسے نہیں دیکھا اور تب ہی اُس نے سوچا تھا کہ اگر یہ پودا بچ جائے تو

ہو سکتا ہے پروان چڑھ کر ایک گھنا درخت بن سکے۔ پھر اُسے یہ بھی خیال آیا کہ ہائی وے کے دونوں کناروں پر دُور دُور تک کوئی درخت نہیں تھا۔ تبھی اُس نے کچھ پتھر اٹھا کر اس پودے کے چاروں طرف رکھ دیئے تھے۔ ایک دن اُن پتھروں کے گھیرے میں کھڑے پودے کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔ پودے کی تازگی میں کمی آگئی تھی۔ اُسے خیال آیا پودے کو پانی کی ضرورت ہے۔ پھر ہر دوسرے تیسرے روز اُس پودے کو پانی دینا اور اُس کا خیال رکھنا اس آدمی کا معمول بن گیا۔

پھر یہ ہوا کہ جیسے جیسے وہ پودا بڑھتا گیا۔ اُس آدمی کی دلچسپیاں بھی بڑھتی گئیں۔ اُس نے اپنی کمر سے بھی اونچے ہونے والے پودے کے چاروں طرف لکڑی کا ایک جنگلہ سا بنا کر لگا دیا تھا تاکہ جانور اُس کی پتیاں نہ چبا سکیں۔ پودے کے چاروں طرف اُس نے گڑھا کھود کر اچھی مٹی اور کھاد بھی ڈالی تھی۔ دھیرے دھیرے کچھ جانے اور کچھ انجانے میں وہ اس پودے کی خدمت کرتا رہا۔ پودا بڑھا اُس کا تنا موٹا ہوا، شاخیں پھیلیں لیکن اس درخت کے پورے وجود میں ایک [illegible] اور لچیلا پن سا قائم رہا جس توانائی، مضبوطی، بلندی اور استقامت کی ایک، ہرے بھرے درخت کو ضرورت ہوتی تھی وہ اُس میں نہ آتی تھی۔ اُس کے ذہن پر اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ لیکن مرتے مرتے زندگی کے گزرے ہوئے مناظر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے سامنے آ جا رہے تھے۔ اُسے یاد آیا۔ نہیں کبھی ایک اسکول کے ننھے مُنّے بچے پکنک پر آئے تھے اور جب یکایک بارش آگئی تھی اور اس ننھے سے درخت نے اُن میں سے کچھ بچوں

کر اپنے نیچے اپنی بساط بھر پناہ دی تھی تو اُسے بڑا اچھا لگا تھا۔

آج ہائی وے کے کنارے کھڑے ہوئے اس درخت کی شاخ میں رسّی سے بندھا وہ جھول رہا تھا اور جسم کے بوجھ سے اُس کی گردن کی ہڈی ریڑھ کی ہڈی سے ٹوٹ کر الگ ہونے جا رہی تھی۔ اُس کی موت تیزی سے سرکتی ہوئی گلے کی شریانوں کے اندر سے گزرتی ہوئی اُس کی آنکھوں کے حلقوں میں پہنچ کر اُنھیں پھیل رہی تھی۔

اُس کی زبان دانتوں سے قدرے باہر آگئی تھی۔ چہرہ پہلے نیلا اور پھر کالا ہو چلا تھا۔ جھولتی ہوئی شاخ اب لگ بھگ ساکت ہو چلی تھی۔

تبھی اُس کی آنکھوں کی ڈوبتی ہوئی روشنی نے دیکھا اس تنہا درخت کے پاس جیسے سلسلے وار گھنے گھنے بھرے بھرے بدن والے بھاری بھرکم درخت اُگتے چلے جا رہے ہیں۔ موٹی موٹی شاخوں والے سایہ دار درخت اتنے اونچے کہ اُن کی شاخوں پر زمین پر کھڑے کھڑے رسّی کا پھندا ڈالنا اتنا آسان نہ تھا۔ اپنی اس تمام خیالی اور فریبِ نظر پر وہ مسکرا دیا۔ اُس کی یہ ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر جم گئی اور وہ مر گیا۔

اسی عرصے میں اُس کے کانوں نے ایک آواز سُنی جو ہائی وے کی دوسری سمت سے آ رہی تھی ــــ دُور، بہت دُور گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کانپ رہی تھی۔

یہ آوازیں جانے والے گھوڑوں کی نہیں بلکہ آنے والے گھوڑوں کی تھیں۔

اُس کے ذہن کی آنکھوں نے دیکھا۔ اُس کے تلوؤں کے نیچے زمین پر درخت سے تھوڑا ہٹ کر ایک پودا اور اُگ رہا تھا۔ تب ہی اُس کے دماغ نے کسی انجانی اور اَن سُنی زبان میں کچھ بڑبڑانا شروع کیا — شاید وہ کہہ رہا تھا۔

"ہائی وے یا تو تُو اور لمبی ہو جا تاکہ جو مجھ پر سے آرہے ہیں اُنھیں یہاں تک پہنچنے میں دیر لگے۔ یا اس پودے کو اتنا بڑا کر دے کہ اُن کے آنے تک یہ اس قدر بلند ہو جائے کہ وہ اتنی آسانی سے اس کی شاخ میں رسّی کا پھندا نہ ڈال سکیں۔"

لیکن —

نہ تو ہائی وے لمبی ہوئی

نہ دُور سے آنے والی ٹاپوں کی آوازیں ہی ٹھہریں۔

اور نہ پودا ہی ایک دم سے بڑا ہوا۔

ہاں رسّی کے پھندے میں لٹکے ہوئے اُس مُردہ آدمی کا دماغ بھی اب مر چکا تھا۔

■

ایک حلفیہ بیان

میں مقدس کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ سچ سچ بیان کروں گا۔
اُس سچائی میں آپ کو شریک کروں گا جو صرف سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔

یہ ایک رات کی بات ہے۔
یہ ایک اندھیری سنسان برسات کی رات کی بات ہے۔
یہ ایک ایسی رات کی بات ہے جب میں اکیلا اپنے بستر پر لیٹا تھا اور دیوار پر ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ روشن دان کھلا تھا۔ بارش کا موسم تھا۔ ٹیوب لائٹ پر بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ یقیناً یہ برساتی کیڑے تھے۔ تب ہی میرے سر کے اُوپر سے مسہری اور کمرے کی چھت کے درمیان فضا میں بھنبھناہٹ کی آواز کے ساتھ کسی قدر بڑے کیڑے کے اُڑنے کی آواز آئی اور پھر مسہری کے برابر فرش پر پٹ سے کسی کے گرنے

کی آواز ___ یہ آواز اتنی واضح تھی کہ میرا دھیان اُس کی طرف چلا گیا۔
کیا گرا تھا ___ ؟ آپ ضرور یہ سوال کریں گے ؟
اگر میں چاہوں تو اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آپ کو دوسری باتوں میں کافی دیر اُلجھائے رکھ سکتا ہوں لیکن آپ خود پہلے سے بہت اُلجھے ہوئے ہیں اور وقت کم ہے اور صبر و تحمل سے آپ سب ہی گھبراتے ہیں اور فوراً اصل معاملات تک پہنچنے کی آپ میں ظالمانہ حد تک عادت پڑ چکی ہے ___________

___________ اور یہ کہ آپ کو جزئیات سے نہیں اصل سے دلچسپی زیادہ ہے اور یہ بھی کہ سچائی کو آپ دو ٹوک ہی پسند کرتے ہیں اس لیے . . . .

. . . . اس لیے میں تمام تہذیبوں اور قوموں اور انسانی برادریوں کے تمام خداؤں کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ آپ کو صحیح اور ٹھیک ٹھیک بتا دوں گا۔
یہ ایک رات کی بات ہے۔
یہ ایک اندھیری سنسان برسات کی رات کی بات ہے۔
یہ ایک ایسی رات کی بات ہے جب میں فرش پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سُن کر اُس کی طرف مخاطب ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا مسہری کے قریب بس مشکل سے ایک سیر دو سیر ایک کالے رنگ کا بد ہیئت، بدشکل، بد رو، بد قماش، بد نظر، بد طینت کیڑا پیٹھ کے بل اُلٹا پڑا ہوا تھا۔ اس کیڑے کے

موٹے، بھدّے اور گول گول سے چھوٹے سے جسم پر غالباً دو پر بھی تھے۔ چھوٹے سے باریک دو پر۔ ان پروں کی لمبائی اُس کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے بہت ہی چھوٹی تھی۔ اُس کی کئی ٹانگیں تھیں، چار بھی ہوسکتی تھیں یا چھ بھی۔ اُنھیں گنا اس لیے نہیں جاسکتا تھا کہ وہ اُنھیں برابر چلائے جارہا تھا۔ پیٹھ کے بل فرش پر پڑا ہوا وہ برابر اپنے پیر چلائے جارہا تھا۔ میں اُسے چپ چاپ مسہری پر لیٹے لیٹے دیکھتا رہا۔

چکنا فرش

کیڑے کی پیٹھ بھی شاید چکنی تھی۔

○

کیا آپ جانتے ہیں کہ پھر کیا ہوا ۔۔۔؟

آپ میں سے بہت سے نہیں بھی جانتے ہوں گے۔

ٹانگیں بے حد باریک۔ بھدّا جسم اور اُس پر جسم کا خاصا وزن، بس وہ ٹانگیں چلائے جارہا تھا۔ دو منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ، وہ مستقل اپنے کو پلٹنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

دراصل یہ ایک کوشش کی بات ہے۔

یہ ایک لگاتار، ایک ہی جگہ پڑ کر چکنے فرش سے بے نیاز ہوکر کی جانے والی کوشش کی بات ہے۔

یہ ایک اندھیری بے معنی رات میں ایک بے مقصد کوشش کی بات ہے۔

جب پیٹھ چکنی ہو۔
فرش چکنا ہو
پر چھوٹے ہوں
ٹانگیں باریک ہوں
اور اُن کی دسترس میں فضا تو ہو زمین نہ ہو۔

(ریپیٹ)

اور اُن کی دسترس میں فضا تو ہو زمین نہ ہو۔
اس کے بعد پھر ایک عجیب بات ہوئی۔
کیا بات ہوئی ــــ ؟ آپ سوال ضرور کریں گے۔

اگر میں چاہوں تو آپ کے اس سوال کو پس پشت ڈال کر آپ کو بہت دیر تک دیگر معاملات میں اُلجھا سکتا ہوں کیوں کہ اب مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کی دلچسپی اس کیڑے میں کچھ بڑھ گئی۔ کیونکہ اس طرح کے کیڑے آپ نے بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو ایک بار پیٹھ کے بل اُلٹ جائیں تو پھر سیدھے نہیں ہو پاتے۔ اس لیے ....

اس لیے میں انسان کے خون میں دوڑتے ہوئے ایسے تمام سرچشموں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو اُس میں تجسس، استعجاب، حیرت اور رمز کشائی کے لمحات جگاتے ہیں اور میں اُن آسمانی طاقتوں کو حاضر ناظر جان کر اپنا بیان آگے بڑھاتا ہوں جو طاقتیں ہر ذی روح میں جبر برداشت کرنے کی صلاحیتیں بخشتی ہیں جو اُسے وسوسوں اور اندیشوں کی کالی برسات جیسی

راتوں میں چپکا پڑا رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں ــــ میں نے دیکھا کہ وہ کیڑا برابر، رُکے بغیر اپنی ٹانگیں فضا میں اُچھال رہا تھا۔ اپنے پَروں کو بھی نیچے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی یہ کوشش دیکھتے ہوئے اب لگ بھگ ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ سب کچھ بھول کر میں اُسے دیکھ رہا تھا کہ یکایک مجھے خیال آیا۔

یہ حرامزادہ بدعقل اور بدروح ہے
یہ کمینہ اپنے آس پاس کی دنیا سے اب بھی واقف نہیں
یہ ذلیل یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ اس کمرے میں اکیلا نہیں ہے

اگر اس خبیث کو یہ احساس ہو جائے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور جتنی جلد ممکن ہو اس کو موجودہ صورتِ حال سے چھٹکارا پا لینا چاہیے تو شاید یہ کچھ اور تدبیر کرے، شاید اپنے کو سیدھا اُلٹ لینے کے لیے کچھ اور جتن کرے، شاید یہ خوف زدہ ہو کر اپنی کوششوں کو اس قدر تیز کر دے کہ اُس کے سیدھے ہو جانے کا کوئی راستہ نکل آئے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ خائف ہو جائے، اُس کو یہ احساس ہو جائے کہ وہاں اُس کے قریب یا آس پاس کچھ اور بھی ہے۔ کوئی ایسی چیز جس سے اُس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ سوچ کر میں مسہری پر سے اُترا۔ اُس کے قریب گیا۔ اپنا داہنا پیر اُس کے پاس لایا
اور پھر اُس کے قریب ہی زمین پر پیر کو دو ایک بار تھپتھپایا۔

تب ہی ایک عجیب بات ہوئی
میرا خیال ہے کہ وہ بات مجھے آپ کو بغیر کسی بکواس کے بتا دینا چاہیے۔
اس لیے . . . .
. . . . اس لیے میں دنیا کے تمام کمزور و نحیف لاچار مجبور اور نادار انسانوں کی قسم کھا کر اور انھیں حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے وہ سچ سچ بتاؤں گا۔ میرا سچ نہیں بلکہ آپ کا بھی سچ ہوگا کیونکہ اب جو کچھ میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ مجھے پوری امید ہے کہ آپ نے بھی دیکھا ہے اس لیے . . . .
. . . . اس لیے میں ان سارے تجربوں، محسوسات اور انسانی رویوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو میرے ہی نہیں بلکہ آپ کے بھی تجربے، محسوسات اور رویے ہیں کہ میرے پیر کی دھمک کی آواز سے اُس کیڑے پر ایک عجیب اثر ہوا۔ وہ یکایک جیسے بے سُدھ ہو گیا۔ اُس کی ٹانگیں چلنا بند ہو گئیں اور وہ بالکل بے حرکت اس طرح بن گیا جیسے اُس میں جان ہی نہ ہو۔
دراصل یہ ایک بے سُدھ اور اپنے کو مردہ ظاہر کر دینے والے کیڑے کی بات ہے۔
کسی باہری خوف کے تحت اپنے کو پُر سکوت، پُرامن اور INEFFECTIVE ظاہر کر دینے والے ایک وجود کی بات ہے
وہ بات جو ایک برسات کی رات سے شروع ہوئی۔
جو ایک اندھیری سنسان رات میں ایک اُلٹے پڑے ہوئے کیڑے کی

کہانی بن گئی۔

جو اس کیڑے کو ذرا سے باہری خوف کے سبب مردہ بن کر پڑے رہنے کا ناٹک سکھا گئی اس لیے......

......اس لیے میں تاریخ کے ان سارے معزول، شکست خوردہ، ہزیمت یافتہ، بدنصیب، پٹے اور ہارے ہوئے ظلِ سبحانیوں، عالیجاہوں، راجوں مہاراجوں، شمشیر زنوں اور فوجی جرنیلوں کی قبروں اور سمادھیوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ اُس برساتی کیڑے کا وہ ناٹک دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اُس کو ایک ٹھوکر ماردی، ٹھوکر سے وہ تقریباً چند فٹ دور پھسلتا چلا گیا ـــ ایسا لگ رہا تھا جیسے سوڈے کی بوتل کا ڈھکن ہو، اسی طرح بے جان، بے حرکت وہ پڑا رہا جیسے سمجھاتا چاہ رہا ہو۔

"یار تم کس چکر میں ہو ـــ میں بھی کوڑا کرکٹ ہوں ـــ اپنا کام کرو یار اپنا کام۔"

وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اب کمرے کی دیوار اُس سے ایک آدھ فٹ ہی دور تھی۔ میں پھر اُس کے قریب گیا۔ پیر سے اُس کو پھر ادھر اُدھر کیا۔ وہ ہر بار اس طرح بے حس و حرکت چپ چاپ ٹھوکر سے ادھر اُدھر ہوتا رہا۔ آخر کو میں مسہری پر آکر لیٹ رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے پھر اُس کا خیال آیا۔ دیکھا تو پھر جلدی جلدی وہ اپنی ٹانگیں چلا رہا تھا۔

میں نے پھر اُس کو باہری خطرے سے پیر تھپتھپا کر آگاہ کیا۔ وہ پھر مردہ

بن گیا۔

یک گھنٹے بعد وہ پھر پیر چلا رہا تھا۔

میں نے پھر اُس کو احساس دلایا باہر خطرہ ہے، وہ پھر دم سادھ گیا۔

تو ہوا یہ کہ یا تو اُس کے پیر بہت تیز چلتے تھے یا ساکت ہو جاتے تھے۔ بیٹھم جہاں تھی وہیں تھی اور اس لیے . . . . . .

. . . . . اس لیے میں دنیا کے اُن سارے اداکاروں، اسکارموڑدوں، نقالوں، بازیگروں، بہروپیوں، بھانڈوں، نٹوں اور کرتب بازوں کے بین الاقوامی تماشوں، اداکاریوں اور کھیلوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو کچھ آپ بھی دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں لیکن اُسے بیان نہیں کر پاتے ہیں، اُس کو بیان کر دوں گا اور ایک لفظ جھوٹ نہیں بولوں گا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی وہ کیڑا مجھ کو اُسی جگہ ملا۔ اُس کے پیر اسی طرح فضا میں تیزی کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ اُسی طرح پیٹھ کے بل پڑا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک عجیب بات ہو گئی۔

کیا بات ہوئی؟ ـــــ میرے خیال میں اب آپ یہ سوال نہیں کریں گے۔ کیونکہ ایسی حالت میں کوئی عجیب بات نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ یہ ساری بات ایک اندھیری بے معنی رات میں ایک ایسی بے حصول کوشش کی بات ہے جب کر پیٹھ ٹیکی ہو، فرش چکنا ہو، پھر

چھوٹے ہوں، ٹانگیں باریک ہوں اور اُن کی دسترس میں زمین نہ ہو اس لیے
..... اس لیے میں یونان کی عظیم المیہ داستانوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جن
میں ظالم بھی اُتنا ہی لائق احترام ہے کہ جتنا مظلوم کیونکہ ٹریجیڈی وہی ہے جس
میں کسی کے لیے کوئی راہ فرار نہ ہو۔ جہاں بیٹھو بھی بے قصور رہو اور قربیش بھی۔
اس لیے میں اُن ساری حکایتوں کی قسم کھاتا ہوں کہ جن میں انسان اپنے درد
اور اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو سینے سے لگائے تڑپتا رہا اس لیے کہ میلو ڈرامہ
کی گنجائش نہ تھی کیونکہ فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ اس لیے میں صرف اُتنا ہی
آپ کو بتاؤں گا کہ جو سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔

ملک یاقوت کا نوحہ

سب اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔
امیر آخور جمال الدین یاقوت
شمس الدین التمش

قطب الدین ایبک اور اُس کی نواسی رضیہ سلطان، کائنات کتنی بسیط ہے، انسان کتنا دوغلا ہے، وقت کس قدر جامد ہے۔

ملک یاقوت، مراقش کا وہ غلام جس کے وطن کو عیسائیوں نے تاراج کیا جو پابہ جولاں دلّی کے دربار میں لایا گیا، التمش کے ہاتھوں بکا جسے رضیہ نے شاہی اصطبل کا نگراں مقرر کیا۔

وقت کیا ہے؟ ہم میں اور ملک یاقوت میں جو قُرب ہے وقت اُسے کس عنوان سے لکھے گا، ہم ملک یاقوت ہیں، ملک یاقوت ہم تھا، ملک یاقوت ایک مسلسل وجود ہے۔ ملک یاقوت کو دوام کیوں حاصل ہے یعنی ہم کب مریں گے۔

رضیہ تم ایک خواب تھیں، ایک امید تھیں، بیس کروڑ حریت پسند انصاف پسند انسانوں، غلاموں، غریبوں اور ملوک چہلگانی کی آس تھیں۔ کوہستان سلیمان سے کوہستان کاہی اور ہمالہ سے بندھیاچل تک تمھارا پرچم لہرایا۔ تم جمال الدین یاقوت کو کچھ نہ دے سکیں۔

لیکن سب اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔

اگر یاقوت نے رضیہ کو چاہا تھا، اُسے اپنا مقدر بنا لیا تھا تو بھوکے شیروں کے کٹہرے میں جانے سے پہلے وہ ضرور مُسکرایا ہو گا۔

لیکن ہم ایک غلام بر نام جمال الدین یاقوت ہماری اُمید، ہماری آس کبھی ترک اور کبھی غیر ترک ملوک کی سیاست میں دم توڑ دیتی ہے تو کبھی تخت و تاج کے لوبھی اختیار الدین ایمن نظام الملک محمد جنیدی و دبیر اُرد علی اسمٰعیل اور ملکۂ شاہ ترکان جیسے سازشیوں کی بھیانک سازشیں ہمارے بھوکے شیروں کا انتظام کرتی تھیں۔

رضیہ! تم ایک آدرش تھیں۔ بے پناہ جوہر و توانائی کی مثال تھیں تم۔ لیکن تم اپنی مسند پر بیٹھے بیٹھے دیکھتی رہیں۔ ملک یاقوت کو کڑھتے تڑپتے بلکتے دیکھتی رہیں۔ تم صرف خطابات بانٹتی رہیں۔

یہ قاضی منہاج الدین ہے۔ عالم تاریخ ہیں، تم نے اسے صدر جہاں بنا دیا دیوان قضاۃ صدر القصدور کہلایا۔

یہ نظام الملک ہے، یہ ملک الامرا۔ یہ امیر شکار اور یہ عرض ممالک خطابات اُمورِ سلطنت کے جھاڑ فانوس ہیں سجنے میں اچھے لگتے ہیں لیکن ملک یاقوت

جو نادار تھا، بے کس و بے وطن تھا، تم اُس کی وفاؤں کو غلامانِ شمسیہ کی محفلوں میں معتبر نہ بنا سکے ـــــ قصّہ یہ ہے رضّو بٹیا کہ جب بھی اقتدار نے کسی کی وفا کو معتبر ثابت کرنا چاہا ہے ہمیشہ کسی جنیدی اور کسی اختیار الدین کی بن آئی ہے۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم نے بڑی بھول کی۔

رضیہ اگر تم سب کا مقدر تھیں، اگر تمھارے لیے جینا تمھارا تحفظ اور تمھارا ناموس ایک اٹل حقیقت تھی تو ملک یاقوت کے لیے تم کس قدر کمزور ثابت ہوئیں۔

وقت بادشاہوں کو اُن کے شاہی چبوترے سے نکال کر اُنھیں جینے کیوں نہیں دیتا۔ وقت نے کبھی ایسا بادشاہ پیدا نہیں کیا جس کے دائیں بائیں چند زیرک غلام، چند موقع شناس بلبن اپنی تلواروں کو نیام میں چھپائے، گھات میں لگے، سوتے جاگتے اپنی آنکھوں میں ایک سفاک چمک لیے خاک بوس نہ رہتے ہوں۔

التمش مر گیا ـــــ رضیہ التمش مر گیا۔

ہم یعنی ملک یاقوت اپنے مرے ہوئے التمش کا نوحہ پڑھ چکے۔ نوحے تاریخ نہیں بناتے۔ نوحے تھکن کا ایک وقفہ ہیں۔ ایسا وقفہ جو تازہ دم کر دے۔ ملکۂ شاہ ترکان یعنی التمش کی بیوہ تک اسی زرخیز عرصے میں بڑے بڑے خواب دیکھ ڈالتی ہے۔

التمش کیا تھا؟ شیرازہ بندی کی ایک قوت، وحدت استقامت اور اکائی کی ایک علامت جس میں ہیبت بھی تھی اور جلال بھی، صداقت بھی تھی

اور انصاف بھی۔

التمش مر گیا۔ اپنی موت مرنا ایک اعجاز ہے۔

ملک یاقوت تم نے بڑی غلطی کی۔ تم کو ہجرت کرنا تھا۔ تم جس کا سارا جہاں وطن ہے کیوں کر تم یوں نہیں مر سکتے۔ جب تک تم کو کوئی مارے نہیں۔ تم یونہی ایڑیاں رگڑتے رہو گے۔ اپنے آپ سے اپنی موت مرنا کمال اعجاز ہے جو زندہ لوگوں کو ہی ملتا ہے۔ التمش جلدی جلدی نہیں پیدا ہوتے۔

کیا تم واقعی رنجیدہ ہوئے تھے جب تم نے پہلی بار یہ جانا تھا کہ بلقیس دوراں، بنتِ ابونصر شمس الدین التمش کے دل میں تمھارے لیے کوئی نرم گوشہ بیدار ہے۔

تم کتنی اداسے کہتے ہو گے ۔۔۔ "رضو ڈارلنگ آؤ میری باہوں کا سہارا لو میں تمھیں اسپ شریر کی پیٹھ پر بٹھا دوں۔ رضیہ کا بدن تم نے اپنے ہاتھوں سے کیا چھوا گویا آسمان کے تارے چھو لیے۔ بات صرف اتنی ہے ملک یاقوت کہ تم ہمیشہ سے گاؤدی تھے، تم ہمیشہ گاؤدی رہو گے۔ ملکہ نے تمھاری طرف ایک بار شمسی تمکنت و وقار سے مسکرا کر دیکھ لیا اور تم مزے میں آکر موت کو بھول گئے۔

جہاں بانی اور جہاں گیری غلاموں کا نہیں آقاؤں کا مشغلہ ہے۔ دیکھو بڑی بڑی تہذیبوں کے کتبوں پر کیا لکھا ہے؟

آقا کون ہے؟

آقا وہ ہے جو قادر ہے۔

قادر کون ہے؟

قادر وہ ہے جو قوی ہے۔

قوی کون ہے؟

قوت اُس کی ہے جو کثرت میں ہے۔

کثرت کیا ہے؟

کثرت غلبے اور تحمل بخش مدافعت کا دوسرا نام ہے۔

رضو بیگم! ہر دور میں ملک یا قوتوں کو ٹوٹی پھوٹی تحمل بخش مدافعت ہی ہاتھ آتی ہے اور غلبہ کو اختیار الدین صاحبان نے ایک گھاس گھٹر کے مانند باندھ کر ملک یا قوتوں کے سامنے لٹکا دیا ہے اور وہ بھوکے گھوڑے کی طرح اُس تک پہنچنے کے لیے ساری عمر اپنی پوری قوت سے وقت کے پہیوں کو ٹھیل ٹھیل کر ہانپ ہانپ کر اُس پر مُنھ مارنے کے جتن میں لگے رہتے ہیں

رضو ڈیر ـــ وہ تاریخ کب لکھی جائے گی جب وقت کے پہیے میں جُتے ہوئے ملک یا قوتوں کے مُنھ اس گھٹر تک پہنچ جائیں گے۔

وہ گھٹر کیا ہے؟

غلبہ ـــ

بدن کا فطرت پر، غلامی کا آقائیت پر، محرومی کا اختیار پر، انصاف کا ظلم پر۔ غلبہ غلبہ غلبہ ـــ

لیکن صرف تحمل،

محض تحمل،

بیمار تحمل

صرف مخض اور بیمار تحمل سے رضیہ روٹھ جاتی ہے۔
اور ملک یاقوت تم نے رضیہ روٹھ گئی۔
ملک یاقوت تم نے کچھ نہ کیا۔

تم اپنی فطرت، اپنی جبلت، اپنے بدن، اپنے نفس اور اپنی مردانگی کے لیے کبھی کچھ نہ کر سکے۔ رضیہ عورت ہے اور دیکھو کہ عورت کے باب میں تاریخوں میں کیا لکھا ہے۔

وہ شائد اپنی فطری شرم سے پہل نہیں کر سکتی یا پھر اُسے مرد کی پہل کا صرف اس لیے انتظار رہتا ہے کہ وہ لذت بخش ہوتی ہے۔ تم چپکے سے ایک رات حرم سرا کے دربانوں کے سینے میں خنجر بھونک کر اندر داخل ہو جاتے۔ بستر شاہانہ پر تمھیں ایک تڑپتا چھلکتا انگ انگ اور پور پور میں ہجر و فراق کا درد لیے کندن سا دمکتا ایک جسم ایک گرم گرم بدن ازل سے تمھارا منتظر پا ہیں کھولے تمھیں اپنی پناہ میں لے لیتا۔

تم اُس کے جلتے، دہکتے اور مہکتے رخساروں اور ہونٹوں کو چومتے چاٹتے کاٹتے، بھینچتے اور جنم جنم کی پیاس بجھا لیتے اور باہر دربانوں کا سُرخ سُرخ خون دھیرے دھیرے رِستا، دور غلاماں کی چاندنی میں رینگتا کچھ دور جا کر جم جاتا۔ وقت تھم جاتا اور تم اپنی نسل کے جنسی استحصال کے پیدائشی حق کو دنوں کا را بنا دیتے کہ بستر شاہانہ پر سمٹتا اور سہمتا بدن اپنی ساری تابانیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ سینے سے کمر سے، کولھوں سے درجہ بہ درجہ عریاں ہوتا

چلا جاتا تم اس سے سہج سہج نہ تھم نہ تھم کچھ بولتے، تمھاری سرگوشی پردہ
آنکھیں بند کیے لرزتے کپکپاتے ہاتھوں سے تمھاری توانا اور مضبوط باہوں کو
سہارتی تم اُس کے ابروؤں، ٹھوڑی اور گردن کو چومتے اُس کے بدن کی
کنمناہٹوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیتے اور باہر سارے کے سارے محمد جنیدی،
اختیار الدین، نظام الملک اور دیگر ارد تمھارے بستر تعیش سے اُٹھتی ہوئی
خوشیوں کے حاسد اپنی تمناؤں کے غلیظ خون میں لت پت سسک سسک
کر مر جاتے۔

کارنامے آسمانوں سے نہیں اُترتے۔

پوری پوری تاریخوں کے ساتھ زنا کرنے والے جیالے روح کی
شہوانیت اور بدن کے ہجر کی آگ میں اپنے کو پھونکتے نہیں بلکہ وصل یار کے
جوش میں سمندروں اور دوزخوں کو پھاند کر ملن اور وصال کی ایک ایک گھڑی
کی لذت کو انگ انگ میں سمیٹ لیتے ہیں۔

آپ میں اور ملک یاقوت میں اے تمت نشاں صرف ایک ہی تو فرق ہے
کہ آپ شادیاں کر کے بیوہ ہو جاتی ہیں اور وہ آپ کو کبھی دلہن بنے دیکھ کر تو
کبھی ڈولا اُٹھتے دیکھ کر لمبی سی سانس بھر کر رہ جاتا ہے

افلاطونی محبتیں تاریخ ساز محبتیں نہیں ہیں۔

لیکن سب اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں امیر آخور جمال الدین یاقوت،
شمس الدین التمش، بلقیس یہاں حضرت رضیہ سلطان۔

کائنات کتنی بسیط ہے۔ انسان کتنا دوغلا ہے۔ وقت کتنا پیارا ہے۔

ہم میں اور ملک یاقوت میں اگر کوئی فرق ہے تو وقت اس کو کس عنوان سے لکھے گا۔

قبل اس کے کہ کوئی منہاج الدین تاریخ نویسی کے منصب کے لیے صدرِ جہاں مقرر کیا جائے۔

کوئی چپکے سے یاقوت کو جگا دے اور کہہ دے اس سے کہ ایک ہی بار سہی ایک شب کے لیے ہی سہی اُس بسترِ کمال پر اُس قامتِ رعنا کے پہلو سے لپٹ جائے۔ آرام سے سو جائے۔

ایک قتل کی کوشش

ایک میں ہوں ـــــ متحیر اور مبہوت
ایک ذرہ ہے۔ پیتھالوجسٹ!
بہت دنوں سے یہ پیتھالوجسٹ مجھ سے کہہ رہا ہے۔
"دیکھو! جو کچھ خارج ہو کر باہر آتا ہے بس وہی میرا مقدر ہے۔"
ایک چھوٹے سے اسپتال کا کمرہ ـــــ میری خورد بین ٹسٹ ٹیوب، بہت سے فلاسک، شیشیاں، ہری لال نیلی۔ پاخانہ، پیشاب، بلغم، تھوک!
آج پھر ایک آدمی مر گیا ـــــ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُسے زندہ کر دوں اور کہوں کہ وہ اپنا بیان دے کر میری رُوح کا بوجھ ہلکا کر دے۔
مجھے نہیں معلوم کہ جھوٹ اور سچ کیا ہے۔ اپنے پیشے میں رہتے ہوئے میں یہ بھی لکھ سکتا ہوں کہ پیشاب میں شکر آنے پر ڈاکٹر کون سی دوائیں لکھ دیا کرتے ہیں پیچش کے کیڑے کن دواؤں سے مارے جاتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں انسان کے سارے Organism سے واقف نہیں

ہوں۔ میں صرف کیڑے پہچانتا ہوں ـــــ لیکن آج ایک آدمی مرگیا میں برسوں سے اُس کا پیشاب، پاخانہ ٹسٹ کرتا آیا ہوں۔ ساری ساری رات، سارے سارے دن کتنے ہی مرکبات ڈال کر، کتنی ہی بار آگ پر پکا کر، کتنی ہی سلائڈوں پر رکھ کر اُس کے پاخانے کی جانچ کی ہے میں نے۔ ڈاکٹر اکثر مجھ پر برہم ہوتے رہتے ہیں۔ میں اتنا ایمان دار کیوں ہوں ـــ ؟ کیوں نہیں میں آنکھ بند کر کے لکھ دیا کرتا ہوں

شوگر ـــــ Nil

البومین ـــــ Nil

پس سل ـــــ Nil

یہ ـــــ Nil

وہ ـــــ Nil

میں نے کسی کی زندگی کا ٹھیکہ تو لیا نہیں ہے ـــ کیا مری دی ہوئی رپورٹوں نے سب کو بچا لیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ "گو" میرا مقدر ہے۔ میں اپنے آپ کو اس قدر Important کیوں سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر لوگ میری سُنتے بھی کب ہیں؟ اور وہ سُنیں بھی کیوں؟

"تم گدھے ہو۔" ـــ ڈاکٹر کہنے لگے ہیں۔

"نہیں میں پیتھالوجسٹ ہوں۔"

"لیکن تم پریکٹس نہیں کرسکتے۔"

"میں نے کب کہا؟"

"میں رپورٹ لکھواؤں وہ تمھیں لکھنا ہوگی۔"

—— میں سب سے کیسے بتاؤں کہ میری کائنات ایک بہت بڑا ہسپتال ہے، میں اس ہسپتال میں خوردبین لیے بیٹھا ہوں، طرح طرح کے کیڑے جراثیم رینگتے اور کلبلاتے ہوئے ایک نقطہ کے کروڑویں حصّے کے برابر میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

"دیکھو میں اس اسپتال کا مالک ہوں —— میں تمھیں بے دخل کردوں گا۔"

اسپتال کا ڈاکٹر مجھے دھمکی دیتا ہے۔

لیکن تم ایسا نہیں کروگے۔ میں اس ہسپتال میں جیا ہوں۔ میں نے اس کو برسوں سونگھا ہے۔ اس کے تعفن کو اپنی رگ رگ میں بسایا ہے میں نے۔ اس میں پڑے ہوئے سفید سفید بجبجاتے ہوئے کیڑوں کو بڑے پیار سے اپنے کانوں اور آنکھوں پر رینگتے ہوئے محسوس کیا ہے میں نے۔ یہ سارے ٹسٹ ٹیوب بیکر فلاسک اسپرٹ لیمپ، سلائڈز ان سب پر میری مہر ثبت ہے۔ تم مجھے بےدخل کردوگے تو کیا ہوا میری خوردبین کو مجھ سے نہیں چھین سکتے۔ وہ برابر کام کرتی رہے گی، رپورٹیں لکھتی رہے گی۔ پیپ، خون، تھوک اور پاخانے کی یہاں کمی نہیں۔

"ہمیں تمھاری رپورٹوں کی ضرورت نہیں۔ ہم اس کے بغیر بھی کام چلا لیں گے۔"

"ایسا تم کیوں سوچتے ہو ——؟"

اس لیے کہ وہ آدمی مرگیا، تمھاری رپورٹوں کے باوجود مرگیا۔"

"کیا تمھاری دواؤں سے آدمی نہیں مرتا؟ کیا تم ہر ایک کو موت سے بچا لینے پر قادر ہو؟"

"ہمیں نہیں معلوم۔ کیوں کہ ہم ڈاکٹر ہیں اور ہم خدائی کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔"

"تو پھر آدمی کے نجات دہندہ تو تم بھی نہیں ہو۔ میں بھی نہیں ہوں۔ لیکن ڈاکٹر تم اس باریک فرق کو کیوں نہیں سمجھتے کہ تم مجھے ایک Lavatory سے، اس موت گھر سے بے دخل نہیں کرسکتے۔"

"اچھا سنو۔"

"کہو ڈاکٹر۔"

"ہم دونوں ایک سمجھوتہ کرلیں۔"

"میں تیار ہوں۔"

"تم لے دے والا فارمولا اختیار کرلو۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑے گا ۔۔۔؟"

"تم بکواس بہت کرتے ہو سنتے کیوں نہیں۔"

"کہو ڈاکٹر ۔۔۔؟"

"تم مجھے میری سی کرنے دو نا۔"

"میں نے تمھیں کبھی نہیں روکا۔ میں تو اپنی لیب سے باہر بھی نہیں نکلا۔ تم دق کا علاج سلفا ڈائزین سے کرتے رہے۔ تم نے کینسر کے لیے جوشاندہ تجویز کیا۔ تم نے فالج کے مریضوں کو اسپرین پرسکرائب کی میں اپنے ہمپلس

میں مقید رہا۔"

"ہاں میں نے ایسا کیا ۔۔ کیوں کہ یہ میری مجبوری تھی۔ لیکن تم سے پہلے جو پیتھالوجسٹ یہاں تھے۔ اُنھوں نے کبھی اتنا سر نہیں کھپایا۔ وہ آنکھ بند کر کے N نانو لکھتے رہے لیکن تم بہت گھپلا کرتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں تمھیں کس بات پر گھمنڈ ہے۔ یہ سلائیڈس، یہ اسپتال، یہ ٹسٹ ٹیوب، یہ فارمولے، یہ اسپرٹ لیمپ بیکر اور فلاسک سب کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے۔ ہم نے تمھیں اس کے استعمال کے طریقے اور پیمانے بتائے ہیں ہم نے تمھیں پیتھالوجسٹ بنا دیا۔ تم پھُول لتے کس بات پر ہو؟"

"لیکن وہ خوردبین۔"

"ہم اس کے لینسز نکال لیں گے۔"

"Oh no."

"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں کیونکہ ہم اس اسپتال کے انچارج ہیں۔"

میں نے جب گُو سے سمجھوتا کیا تھا تو کہا تھا کہ میری لیب میں آنے والا گُو میرے ضمیر کا سہارا ہے۔ میں اس گُو کی ابدیت اور اُس کی عظمت کا قائل رہا۔ میں یہ جانتا تھا کہ اس اسپتال میں ڈاکٹر آتے اور جاتے رہیں گے لیکن یہ گُو، یہ قاروروں کی شیشیاں، یہ بلغموں کے چلکتے، یہ جرمیری کائنات ہیں، میری شخصیت کا حصّہ ہیں۔ مجھ سے اسی طرح جُڑے رہیں گے کیوں کہ میں ایک پیتھالوجسٹ ہوں میں رات رات بھر انھیں اپنی گود میں لیے بیٹھا رہوں گا۔ جسم اپنے مختلف راستوں سے جو اخراج کرتا ہے۔ مجھے اس اخراج سے محبت کرنا پڑتی ہے۔ نہ چاہتے

ہوئے بھی۔ کبھی کسی کے کہنے پر کبھی خود سے . . . .

لیکن ـــ لیکن وہ آدمی مرگیا۔

اس لیے کہ ڈاکٹروں کو کسی دوسرے آدمی سے زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی۔ آدمی کیا ہے ؟ یہاں کے ڈاکٹروں کے لیے۔

آدمی کیا ہے . . . ؟

زندہ ہنستا کھیلتا ہوا آدمی ـــ

بیمار اور مریل آدمی۔

تنفس کے شکنجے سے اکڑا ہوا آدمی۔

خون تھوکتا ہوا آدمی

بجلی کے کرنٹ سے جلا ہوا

سانپ کے زہر کا ڈسا ہوا

پلیگ کے بخار میں پھنکتا ہوا

یہاں کتنے ہی طرح کے آدمی ہیں یہ بے چہرہ لوگ اپنے ناموں سے نہیں اپنے مرض سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے اُس سے بتایا ـــ "ڈاکٹر تم کوئی نئی بات نہیں کرو گے کیونکہ اس سے پہلے بھی مجھے کئی بار اس اسپتال سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ مجھ سے میرے لن سر لے لیے گئے ہیں لیکن اسپتال کا کام چلتا رہا ہے کہ آدمی کو ہم دونوں مل کر بھی نہیں بچا سکتے۔

"تو پھر تم رپورٹیں کیوں لکھتے ہو۔"

"اس امید پر کہ شاید وہ زندہ رہ سکیں۔"

"بکواس ___ اور زیادہ اخراج کرنے کے لیے ___؟"

"بالکل ___ کیونکہ تمھارے Prescription سے میرے حصے کی لعنتیں تو کم نہیں ہو پاتیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر حالت میں تمھاری بالادستی میرے اوپر رہتی ہے اور مجھے گو سے نہیں بالادستی سے نفرت ہے اس لیے ڈاکٹر تم میرے دجود کی ضد ہو۔ آؤ ہم اپنے اپنے پیشے کی لعنتوں کو کچھ دنوں کے لیے بدل لیں۔ ڈاکٹر میرے اندر بھی Prescribe کرنے کا ایک خواب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تمھیں اس گوُ خانے میں بٹھا دوں اور میں پرسکرائب کروں۔ ساری دنیا کا تعفن تمھارے اوپر ڈال دوں اور میں پرسکرائب کروں۔ تمھارے عمل کے پیچھے جو تجسس کام کرتا ہے اُس کا نشہ بڑا لذت بخش ہوتا ہے۔"

"یہ تمھارا وہم ہے۔ میرے کام میں کوئی تجسس نہیں ہے۔"

"کیا تم کسی آدمی پر یہ سوچ کر محنت نہیں کرتے کہ شائد تم اُسے بچالے جاؤ۔"

"صرف اسی حد تک کہ جس حد تک ہم زمین پر رینگنے والی چیونٹیوں کو اپنے پیروں تلے روندے جانے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حالت میں جب چاروں طرف چیونٹیاں ہی چیونٹیاں ہوں نہ ہمیں مرجانے والی چیونٹیوں کا اندازہ رہتا ہے اور نہ بچ جانے والیوں کا۔"

"تو کیا پرسکرپشن ایک میکانکی عمل ہے؟"

"ٹھیک اُسی طرح جس طرح بیکٹیریا کی تلاش۔"

"تو کیا ہم دونوں ایک میکانکی اور بے ارادہ عمل میں گرفتار ہیں جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تو کل ہی میں اس Lab میں آگ لگا دوں گا۔ مجھے ان غلاظتوں سے نفرت ہے۔"

"میرا کہنا مانو NOTE لکھ دیا کرو اور جمعدار سے کہا کرو پیشاب کی شیشیاں اور پاخانوں کے کٹورے اور ڈبے کہیں دور ڈال آیا کرے۔"

"لیکن تم آخر کیا کرتے ہو ـــ ؟ میرا مطلب ہے تمھاری راہِ فرار کیا ہے؟"

"کوئی ضروری نہیں کہ میں ہمیشہ نبض پر ہاتھ رکھوں۔"

"لیکن جب تمھارا نبض پر ہاتھ رکھنے کو جی چاہتا ہے تب تم کیا کرتے ہو ڈاکٹر ـــ ؟"

"مجھے پتہ نہیں ـــ"

"کیا تمھیں اپنی زندگی کا کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں۔ جب تم نے بے قراری سے یہ چاہا ہو کہ تم کسی کو بچالے جاؤ۔ اس کے لیے تم نے اپنی تمام تر سلاحیتیں اپنے تمام تر علم اور عرفان کی بازی لگا دی ہو جہاں تمھیں نہ وقت کا احساس رہ گیا ہو اور نہ تھکن کا جب تمھارا وجود، تمھارا جینے کا مقصد بس ایک ہی نقطہ پر سمٹ آیا ہو۔"

"یہاں بہت بار ایسا بھی ہوا ہے۔"

"اور تم کامیاب نہیں ہوئے۔"

"ہوا بھی اور نہیں بھی ۔۔۔"

"تمھیں ایسی کامیابیوں پر خوشی نہیں ہوئی۔ ایک ایسا اطمینان اور آسودگی جس کا کوئی نام نہیں۔"

"ممکن ہے ہوئی ہو "

"تو تمھیں میری خدمات کا کوئی اعتراف نہیں۔"

"کیا تم کوئی خدمت واقعی کرتے ہو۔"

○ میں اگر پیتھالوجسٹ ہوں جو کہ میں ہوں تو پھر میں کچھ کرتا ضرور ہوں۔ وہ اسٹول جو میرے پاس بھیجا جاتا ہے یا جو کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچتا ہے۔ آخر اس سے میرا ایک رشتہ ہے۔ ڈاکٹر کی مجھ پر بالادستی کیوں ہے۔ کیا پیتھالوجسٹ ہونا میری مجبوری ہے۔ جب میں انالسس کرتا ہوں جب میں پیشاب میں شکر کا فیصد نکالتا ہوں تو کیا میں ایک گھسے پٹے طریقے پر کام کرتا ہوں۔ کیا میرا کام پیشاب میں چھپی ہوئی سچائیوں کا کوئی بڑا حصہ باہر نکال کر نہیں لاتا۔ کیا میرے ٹسٹ ہمیشہ ٹھیک ہوتے ہیں؟ کیا وہ سیال جو میں قارورں میں چند مخصوص ردعمل کی تلاش میں ڈالتا ہوں سو فیصد ٹھیک ہوتے ہیں۔ کیا کبھی کبھی میں A نام کے آدمی کا خون B نام کے آدمی کی سلائیڈ پر چڑھا کر رپورٹ مرتب نہیں کر سکتا ۔۔۔ کیا قطعی ناممکن ہے؟

○ میرے ہی سہارے نسخے ترتیب دیے جا سکتے ہیں۔ یہاں کچھ عمل نہیں ہے، کچھ ازوال نہیں ہے۔ برائی، طاقت، حکایت، سب غیب ہیں ال

کو اُگایا جاتا ہے۔ اگر بیج اچھا ہے، زمین زرخیز ہے، قدرت مہربان ہے
کسان محنتی اور ہنرمند ہے تو یہ ساری فصلیں اچھی ہوں گی لیکن اُن
جانوروں کو ہم کس خانے میں رکھیں گے جو کچھ نہیں کرتے۔ صرف تیار
فصلوں کو چر جاتے ہیں ــــ نہیں ہم کوئی کلیہ نہیں بنا سکتے۔
لیکن میں ڈاکٹر کی بالادستی قبول نہیں کرسکتا۔ وہ مجھے اسٹول بھیجتے وقت،
قارورے دیتے وقت، کسی خاص بیکٹریا کی تلاش کے لیے ہدایت کیوں کرتا
ہے۔ وہ سارے قیاس پہلے سے کیوں کرلیتا ہے؟ میں اس اسپتال سے
چھٹکارا چاہتا ہوں۔ میں سارے کے سارے ڈاکٹروں کی بالادستی کا منحرف
ہوں۔ میں آزادی چاہتا ہوں ــــ

اس لیے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

مجھے پیتھالوجسٹ کو قتل کردینا چاہیئے۔

آج کی رات میں پیتھالوجسٹ کو قتل کردوں گا۔

میں رات کا انتظار نہیں کرسکتا۔ میں چند لمحوں میں اسے قتل کردوں گا۔

چند لمحے بہت ہوتے ہیں۔ میں ابھی اُس کا قتل کردوں گا۔

مجھے دیکھنا یہ ہے کہ میں پیتھالوجسٹ کو اپنے سے الگ کرکے جی سکتا
ہوں یا نہیں۔ ٹھیک ہے میں تھوڑی دیر میں اُسے قتل کردوں گا۔

سوچتا ہوں رات تک ضرور قتل کردوں گا۔

وقت ملا تو کل تک وہ ضرور قتل ہوجائے گا۔

ٹھیک ہے دو چار روز بعد سہی لیکن میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔

اس لیے کہ میں اپنے وجود سے اپنے اندر کے پیتھالوجسٹ کا پیچھا چھڑا کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری مہملیت میں کوئی فرق پڑا یا نہیں۔

○ رات میں پیتھالوجسٹ کو قتل کر چکا ہوں۔ اب سویرا ہوا چاہتا ہے۔ میرے دروازے پر ابھی اخبار والا اخبار ڈال گیا ہے۔ میں اخبار اٹھاتا ہوں، پہلا صفحہ کھولتا ہوں کہ میرے کانوں میں ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے ٹیسٹ ٹیوب بج رہے ہوں، جیسے سلائڈس آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ میں ایک جانی پہچانی سی آواز سنتا ہوں۔

"کون ـــ؟ کون ہے؟" میں سوال کرتا ہوں۔

"ڈسٹرب مت کرو۔ کام کرنے دو۔" جواب ملتا ہے۔ میں اس آواز کو پہچان لیتا ہوں اور میری آنکھوں میں اپنی زندگی کی ایک اور ناکامی پر آنسو آجاتے ہیں۔ وہ مرا نہیں تھا۔ شائد میں زندگی بھر اس مہملیت کے کرب سے آزاد نہ ہو سکوں گا ـــ لیکن نہیں کل ایک کوشش اور کروں گا ـــ آخری کوشش ـــ

پیشاب گھر آگے ہے

ایک باقاعدہ بنے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش۔

جب سب کچھ بنتا ہے تو پیشاب گھر نہیں بنتے

جب پیشاب گھر بنتے ہیں تو لوگ وہاں پاخانہ کر دیتے ہیں۔

پتلون کی فلائی پر بار بار ہاتھ جاتا ہے۔ ایک کشادہ سی صاف ستھری دیوار پر لکھا ہے 'یہاں پیشاب کرنا منع ہے'۔ وہاں دیوار سے لگ کر کہ سایہ ہے لاتعداد خوانچے والے بیٹھے ہیں۔ سامنے سیدھی بھاگتی ہوئی شاہراہ ہے۔ دائیں بائیں دکانیں ہیں مال سے لدی ہوئی۔ چوراہا ہے اور فوارے ہیں چاٹ کی دکانیں، آئس کریم، بھنے ہوئے چنے، ٹی اسٹال، چوڑے چوڑے فٹ پاتھ۔ کہیں کہیں، کنارے کنارے لوہے کی خوبصورت ریلنگز اور آدمیوں کی بھیڑ۔ صاف ستھرے، تیز تیز چلتے اپنے آپ سے باتیں کرتے چھوٹے بڑے آدمی۔

پیشاب کے مقام پر جلن ہو رہی ہے
نسوں کو پوری قوت سے اوپر کی طرف کھینچنے کا عمل نہ
جانے کب سے جاری ہے۔
یہ شاہراہ کسی ویران علاقے سے کیوں نہیں مل جاتی۔ یا
پھر کوئی زیرِ تعمیر عمارت ہی فٹ پاتھ کے کنارے مل
جائے جہاں آس پاس جھاڑیاں ہوں

بہت دیر کا رُکا ہوا پیشاب جب یک بارگی بہہ نکلتا ہے تو جسم کے ایک
ایک عضو کا تناؤ جس مسرت انگیز لذت کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے وہ
لطف و طمانیت قدرت کا ایک عظیم تحفہ ہے۔

ایک باقاعدہ بنے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی
اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش !!

زندگی میں سب سے مبارک عمل کیا ہے؟
Way out کی تلاش۔ ہمارے اندر بہت کچھ گردتا رہتا ہے۔ ستایا
کرتا ہے۔ اور بے چین کر دیتا ہے ہم کو۔ جی چاہتا ہے کہ ہم اُسے نوچ
کر نکال دیں۔

بائیں طرف ایک سنیما ہال ہے۔
بکنگ ونڈو پر سناٹا ہے۔ ہر سنیما ہال میں پیشاب گھر
ہوتا ہے۔
یک بارگی سارے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے

اور اس کے ساتھ پیشاب کی شدت اور بڑھ جاتی ہے
ہے لیکن ہال کے پھاٹک پر تالہ لگا ہے۔ شاید ابھی
شو کا وقت نہیں ہوا۔
چوڑی چکلی سڑک اپنے پورے طمطراق سے جاری ہے۔
فٹ پاتھ کے دونوں طرف سونے چاندی کی دکانیں ہیں۔ سوال یہ ہے
کہ یہ سارے کے سارے لوگ کیا دن میں ایک بار بھی پیشاب نہیں کرتے؟
دکانوں پر کپڑا خریدتے ہوئے لوگ coke کوک پی رہے ہیں۔ coke
ایک درخت کے نیچے گنے کا رس کچلا جا رہا ہے۔
ایک طرف ٹھنڈے پانی کا ٹھیلہ کھڑا ہے۔ جگہ جگہ چائے کی بھٹیاں ہیں۔
پینے کا اتنا سامان لوگوں کے پیٹوں میں جا رہا ہے اور لوگ بغیر پیشاب
کیے گھوم رہے ہیں۔
کیا وہ دنیا کا واحد فرد ہے جو پیشاب کی شدت میں مبتلا ہے۔
شاید ایسا نہیں ہے:
بات صرف اتنی ہے کہ وہ اجنبی ہے۔ یہ سارے کے سارے دکاندار، سڑک
کی یہ بھیڑ، فٹ پاتھ کے یہ تماشائی سب ہی اُن چور جگہوں کو جانتے ہوں
گے جہاں پیشاب کیا جا سکتا ہے۔
چہرہ تکلیف سے بار بار رنگ بدلتا ہے۔ آدمی میں برداشت کی قوت
کی بھی ایک حد ہوتی ہے
جب پیشاب اپنی پوری قوت سے لگا ہو، نہ کھڑے رہنے میں آرام ملتا ہو

اور نہ چلتے رہنے میں جب بار بار آنکھیں آس پاس
کہیں فلائی کے بٹن کھول کر کھڑے ہو جانے کا سوال
کرتی ہوں تو زندگی کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔
باہر کی خوبصورت ترین شے، تیز سے تیز دھماکہ، ہیبت ناک سے
ہیبت ناک واقعہ، خالی خالی سا گزر جاتا ہے۔
یہ جلن مارے ڈال رہی ہے۔
نسیں جیسے اب ٹوٹ جائیں گی۔ کہیں کوئی بوند باہر نہ آجائے۔
اجنبی ہونا تو ایک بہانہ ہے۔ آدمی کہیں اجنبی نہیں ہوتا۔ صرف Way
out کی بات ہے۔ کسی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے
"اے چھوکرے! یہاں پیشاب کرنے کی کوئی جگہ ہے آس
پاس؟"
"آگے ہے آگے۔" جواب ملتا ہے۔
پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش۔
کیوں سیٹھ جی؟ یہاں پیشاب کرنے کی کوئی جگہ ہے
آس پاس؟"
"آگے ہے آگے ـــ"
نیچے انڈرویر بھی نہیں ہے۔ لوگ انڈرویر پہن کر عقلمندی کرتے ہیں۔
شاید اسی لیے نیچے کے کپڑے کبھی کبھی اوپر کے کپڑوں سے مہنگے ہوتے
ہیں۔

"کیوں بابو جی ؟ یہاں پیشاب کرنے کے لیے کوئی جگہ ہے آس پاس۔"
"آگے ہے آگے ــــ"

ہونٹ دانتوں کے نیچے دبائے دبائے، درد کو سہتے سہتے۔ بار بار ابھرنے والی بے معنی جھنجھلاہٹ کو جھٹکتے کتنی دیر ہوگئی، اور کتنا سفر کٹ گیا نہ راستہ کہیں مڑا نہ کوئی نالہ ملا اور نہ کسی دکان کا پچھواڑا۔ لکڑی کی بند دکانوں کے پیچھے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔

"کیوں بھیا پرسرٹ ہین ادھر کہیں پیشاب کرنے کی ــــ"
"آگے ہے آگے۔"

فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں لگی ہیں۔ کبھی کبھی پرانی کتابوں میں نایاب کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن ٹھہرنے کا یارا نہیں، ہر بات کا وقت ہوتا ہے، اتنی مہلت کہاں ؟

"کیوں مہاشے جی ــــ ادھر کہیں پیشاب ــــ"
"آگے ہے آگے۔۔۔"

یہ اسمبلی بھون ہے۔ ٹھیک اس کے سامنے خیمے لگے ہیں جہاں بھوک ہڑتالی پڑے ہیں۔ سیاست زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنا ہی ہوں گی۔

"دادا ــــ یہاں پیشاب کے لیے ــــ"
"آگے ہے آگے ــــ"

نہرو کا سب سے بڑا حریف ہندوستان کا پروگریسو موومنٹ تھا۔ اس لیے انھوں نے سوشلسٹ ہندوستان کا چکر چلا کر سب کو بہکا دیا۔ ربط و تسلسل جب نہ ہو اور تبدیلی کی جلدی ہو تو سماجی ادارے Transform تو کیے جا سکتے ہیں Transfer نہیں کیے جا سکتے۔ سماج آگے ہو گیا فرد پیچھے۔ علاء الدین کا چراغ تو محض ایک کہانی ہے۔

"بھیا یہاں پیشاب . . ."

"آگے ہے آگے۔"

اُردو کے ساتھ ۲۶ سال بڑی بے انصافی ہوئی۔

علی سردار جعفری کا چیک دیر میں کیش ہوا۔

کتنی دیر لائن میں ابھی اور کھڑا رہنا پڑے گا بھئی۔

"پیشاب ـــــ"

"آگے ہے آگے۔"

آپا جان۔ میں دریا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں سچ بول رہی ہوں سارے محلے میں صرف آپا جان بچا ہے۔

"لیکن وہ پیشاب گھر۔"

"آگے ہے آگے۔"

جہاں ہو وہیں کھڑے رہو، جسم کے تناؤ اور اندر کے درد کو سہتے رہو، ایسی حالت میں چلنے سے مثانہ اور بھی Irritate ہوتا ہے۔ سفر بند

کردو۔
مٹھیاں بھنچی ہیں۔ بار بار رگ پٹھے اوپر کی طرف سکڑ رہے ہیں۔ کتنا درد ہو رہا ہے۔

جب پیشاب کی شدت ناقابل برداشت ہو تو اُس کے بارے میں سوچتے نہیں رہنا چاہیئے، نہیں تو Irritation اور بڑھتا ہے۔ لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے۔
چٹکی سے کھال کو بار بار مسلنا۔ کوئی سیدھا سوال کرے تو اُلٹا جواب دینا۔ پیشاب کی شدت ذہن کو دیوالیہ اور روح کو مفلوج کر دیتی ہے۔

"یہاں پیشاب گھر کہاں ہے؟"
"آگے ہے آگے۔"
"نہیں نہیں۔ یہاں پر اسی جگہ پیشاب گھر کہاں ہے؟"
"آگے ہے آگے۔"
"نہیں ابھی، ٹھیک اسی مقام پر پیشاب گھر کہاں ہے۔"
"آگے ہے آگے۔"
"نہیں نہیں میری فلانی کے ٹخنوں سے بالکل جڑا ہوا پیشاب گھر کہاں ہے؟"
"آگے ہے آگے۔"

خدا عورت اور مٹی

شمعیں، عطر، شراب، پوشاکیں اور بدن۔

جوان، گوری، تندرست، جھومتی مچلتی، بانکی چھولداریاں۔

پسینے میں نہائے، دانش جیسے چمکیلے تیز و تند، تھرکتے گھوڑے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا چڑھتا ہوا سورج

تابناک شمشیر بکف زرق برق شہسوار۔

گومتی۔ کنارا۔ پرچم، دولت انگلشیہ۔

چھتر منزل، اُس کا نیلا آکاش سب ایک خدا کے سائے میں تھے۔

قدسیہ بیگم! نصیرالدین! چاندنی، بیلا، جوہی، چنبیلی، موتیا۔

اندیشے، بھیانک مستقبل کے لرزتے کانپتے ہونٹ، خوف اور نامرادی کی شب بیداریاں۔

خلوت! جشن، پھر خلوت، شراب، لڑکیاں، جسم، خلوت، پستان، ناف، زیرِ ناف، کولھے، کمر، لذت اور لذت۔ ہونٹوں سے، انگلیوں سے میٹھ

کر رکھ لینے کی، ایک ایک پل بٹور لینے کی ہانپتی کانپتی ناکام آرزو۔
یہ وہ وقت تھا جب ہم زندہ نہیں تھے۔ لیکن ہم زندہ تھے کیونکہ خدا زندہ تھا اور چونکہ خدا نہیں مرتا اس لیے ہم بھی کبھی نہیں مر سکتے۔
خدا آسمان پر تھا، زمین پر بادشاہ بیگم تھی۔
بیٹا رزیڈنٹ کے ہاتھوں جلا وطن ــــ اور بادشاہ بیگم اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں جلاوطن۔
سب ایک دوسرے کو جلا وطن کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ کہاں سے چلا تھا؟ بادشاہ بیگم تم نے متا جان کی ماں کو مار ڈالا۔ اُس مرنے والی کا بھی خدا تھا۔ خدا جس نے یحییٰ خاں کو تلوار اور گرو گولوالکر کو گائے دی۔

کٹ۔ Cut

کٹ۔ Cut

○ ساؤنڈ ٹریک میں گھپلا ہے! خیر آگے چلو۔ آگے دیکھ لیں گے۔
ملکہ زمانی تم نے کیا کھویا کیا پایا۔ آغا میر وزیر خدا تمھارا بھی تھا، خدا ہمارا بھی ہے، خدا سب کا ہے۔

○ یہ سب کیا بکواس ہے۔ ساؤنڈ ٹریک میں ضرور کچھ گھپلا ہے۔ بیان منظرنامے سے میل نہیں کھاتا۔

دیکھ کچھ رہے ہیں۔ سُن کچھ رہے ہیں۔
محسوس کچھ اور کر رہے ہیں دیکھ کچھ اور رہے ہیں۔
خیر آگے بڑھو ــــ آگے دیکھ لیں گے۔

خدا سب کا ہے۔

وہ جس نے محلوں کی پہلی اینٹ رکھی۔ جس نے انسان کو بے لوث بنایا۔ جس نے ہابیل اور قابیل کو جنم دیا۔

ریزیڈنٹ کا بھی خدا تھا اور ملکہ وکٹوریہ کا بھی۔ ملکہ وکٹوریہ کا خدا چاندی کا تھا، ریزیڈنٹ کا خدا بارود کا تھا۔ لیکن نصیر الدین تمھارا خدا کون سا تھا۔

اور وہ عورت جس نے اپنے آنگن میں ایک لاکھ روپیوں کے ڈھیر کا چبوترہ بنوایا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ اُس ڈھیر کو اپنے پیر کی ایک ٹھوکر مار کر چھڑ دکوں سے غریب غربا میں لٹا رہی تھی اُس عورت کا بھی ایک خدا تھا اور اُن کا بھی ایک خدا تھا جو لوٹ رہے تھے۔ گرتے پڑتے، ژولیدہ مُو، خاک بہ سر، گریباں چاک:

سب اپنے اپنے خداؤں سے منسلک تھے۔

بقال جن کی دکانیں بند تھیں ــــ داروغہ مطبخ، سہ دوزیاں کی ناپ جو نکھ میں غلطاں، گودام کے چوہوں کے مانند تیز دانتوں والے۔ مگر اپنے خدا سے لَو لگائے تھے۔ انگریز لاٹ صاحب جنھوں نے حضرت محل کو یکے از رعایائے دولتِ انگلشیہ کہہ کر مخاطب کیا تھا، کوئی اپنے خدا کو نہیں بھولا تھا۔ وہ خدا جس کی نظروں کے سامنے اودھ کی دو مچھلیاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کانٹا نگل گئیں۔

○ اگر یہ سب نہ ہوتا تو تاریخ کیسے بنتی، تاریخ نہ بنتی تو ہم پیچھے مڑ کر کیسے دیکھتے؟ پیچھے نہ دیکھتے تو دل میں کسک کیسے ہوتی، کسک نہ

ہوتی تو خدا نہ ہوتا۔

Stop it!

Stop it!

ضرور کچھ گھپلا ہے ــــ

یہ کسک جو تاریخ ہے۔ یہ کسک جو آگے بھی ہے اور پیچھے بھی، جو ہم میں بھی ہے اور تم میں بھی اور آنے والوں میں بھی۔ اُن کا، ہمارا اور آنے والوں کا خدا پائندہ باد

(مائی گاڈ۔ ساؤنڈ ٹریک میں دیکھو)

یہ حیات جو صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے اگر آج سے ہزار سال پہلے کی زندگی کے ساؤنڈ ٹریک کو آج کے پس منظر میں کسی طرح بجانے میں کامیاب ہو جائے۔ تو کیا ہوگا؟

نصیرالدین تم پورے مرد تھے، زندگی بھر پوری عورت ڈھونڈھتے رہے۔ بادشاہ بیگم نے تم کو یہ دھمکی کیوں دی تھی ــــ نصیر میں تیری ماں ہوں۔ میں نے تجھے عورتیں، لونڈیاں باندیاں دیں۔ سولہ، سترہ، بیس پچیس، ہر سن و سال کے ہونٹ، سینے، رانیں اور کولھے دیئے۔ اپنی نگرانی میں تیرے بستر عشرت کو ایک ہی رات میں کئی قاتل اور ہوس ریز جسموں سے نوازا۔ میں نے تجھے موت سے زیادہ حقیقی زندگی دی۔ دیکھ نصیر کہہ دے ریزیڈنٹ بہادر سے کہ تیری موت کے بعد منا جان اصل تخت و تاج کا مالک ہوگا۔

بادشاہ بیگم تم عورت نہیں تھیں بس ایک وقار اور مجسم وقار تھیں۔

اُس وقار کی خاطر تم کہاں تک چلی گئیں۔ تم نے یہ بھی نہ دیکھا کہ تمھارا بیٹا مارا جائے گا۔ تم عورت نہیں تھیں کہ تم نے کوئی بھی تخلیق بے لوث نہیں کی۔

ملکۂ زمانی۔ جامُن کی طرح تنومند، لپکتا ہوا شعلہ، کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، مست متوالی چال۔ ملکۂ زمانی تم عورت نہیں تھیں، تم کیریرسیٹ تھیں۔ نہ جانے کب اور کہاں، جانے کس ڈاکٹر دارڈ سے تمھاری ملاقات ہو گئی جو تمھیں محلوں میں لے آیا۔ تمھیں مناجان کی دائی بنایا گیا۔ تم نے اپنے دونوں شوہروں کو دھوکہ دیا۔ تم نے سازش کی۔ تم اپنے سرھانے میکیاویلی کی پرنس رکھ کر سوتی تھیں۔ عالمِ شہوت میں بادشاہ کے کان میں تم یہ کہنا کبھی نہ بھولیں

"میرے سرتاج کیواں جاہ آپ ہی کا لختِ جگر ہے اسے قبول کر لیجیے انگریز بہادر کو لکھ دیجیے کہ وہی آپ کا اصل وارث ہے۔"

○ عورت ایک لطیف احساس ــــ

ایک سمفنی

ایک خاموش اجلی، بیکراں آسودگی بخش لازوال چاندنی۔

عورت کائنات کا درد، کائنات کی نجات، کرسٹن کیلر، مادام رِبن، ممتاز محل، بادشاہ بیگم، خواجہ میر درد

Please stop it.

یہ سب کیا بکواس ہے؟

وقت ہمیں کیا سمجھانا چاہتا ہے۔
یا ہم وقت کے مرقعوں کو آگے پیچھے کرکے انھیں کبھی پرانی اور کبھی نئی آوازیں دے کر کیا سمجھنا چاہتے ہیں ؟
ایسے کام نہیں چلے گا۔ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجائے گا کیونکہ کیونکہ — مٹی مٹی ہے اُس کا کوئی ماضی نہیں۔ زمان و مکان کے قید و بند سے آزاد۔
کبھی کبھی تاریخ ایک دنبہ بن کر حضرت اسمٰعیل کی جگہ ذبح ہوجاتی ہے لیکن بار بار اگر چھری چلے گی تو کون جانے پھر کوئی دنبہ عرش سے نازل ہوکہ نہ ہو۔ دیکھو معجزے بار بار نہیں ہوتے۔
لیکن مٹی مٹی ہے اُس کا کوئی ماضی نہیں۔ اس مٹی میں فریدوں بخت کی ماں بھی دفن ہے اور مرشد زادہ کی مادرِ عالیہ بھی۔
ڈاکٹر وارڈ اور مولانا حالی سب کو اس مٹی نے سمیٹ لیا ہے۔
آگے کی ساری ریل اکسپوز ہو چکی ہے۔ کوئی پرچھائیں نہیں، کوئی آواز نہیں پردہ پر تاریکی ہے۔ آگے کچھ اور مناظر تھے وہ مناظر کیا ہوئے۔
— غالب جنگ! کائنات کا ہر ذرہ پیاسا ہے۔ عورت بھی اس کی پیاس نہ بجھا سکی۔
کسی بھی سمت سے دیکھنا فضول ہے
سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگیا ہے۔
سب چوپٹ ہوگیا۔ سب چوپٹ ہو رہا ہے۔

جنگل کٹ رہے ہیں (۱)

بھوپال کے مولوی حافظ قدرت اللہ ندوی نے پہلے کار سے اُتر کر میرن ڈرائیور پر بچوں کو شکم سیر ہو کر آئس کریم کھلوائی ۔ اس سے پہلے بچے شکم سیر ہو کر تلی ہوئی مچھلی اور سنکا ہوا مرغ بھی کھا چکے تھے ۔

جس گاڑی میں صبح سے قدرت اللہ شہر گھوم رہے تھے وہ بمبئی کے ایک بہت بڑے ساہوکار کی گاڑی تھی جس کا ٹینک منہ تک بھروا کر اور ایک باوردی ڈرائیور تعینات کر کے ساہوکار نے قدرت اللہ کے حوالے کر دیا تھا ۔

جس نائٹ کلب میں قدرت اللہ اور اُس کی بیوی کو کیبرے دیکھنا تھا اُس کے ٹکٹ صبح ہی قدرت اللہ کی جیب میں ڈالے جا چکے تھے ۔ بیوی سے یہ تاکید قدرت اللہ پہلے ہی کر چکے تھے کہ کلب کے لیے جب وہ گاڑی سے اُترے تو اپنا برقعہ گاڑی میں ہی اُتار کر رکھ دے ۔

جس ہوٹل میں پچھلے چار روز سے وہ مع بیوی بچوں کے مقیم تھے اُس کے نرم اور گدگدے کارپٹ پر قدرت اللہ کی بیوی کو ننگے پیر چلنے کا کئی

پارجی چاہا۔ دراصل وہ اس موٹی موٹی گدگدی کارپٹ کو تلوؤں سے چھونا چاہتی تھی۔ اس لیے ایک بار اُس نے شوہر کی نظر بچا کر جب وہ وزیٹرس گیلری میں کھڑی تھی اپنی ہوائی چپل سے پیر نکال کر کارپٹ کو تلوے سے چھو کر محسوس کر لیا تھا۔

پیروں میں خالص نچلے درمیانہ طبقے والی عورتوں جیسی چاندی کی پازیبیں، دو پٹوں والی ہوائی چپل، جسم پر آدھا میلا۔ آدھا اُجلا برقعہ، بچوں کی گھورتی ہوئی حیران حیران سی آنکھیں۔

بھوپال کے ایک قدیم مسلم محلّے سے آیا ہوا یہ قافلہ پچھلے تین روز سے پنج ہزاری ہوٹل کی راہداریوں میں سرگشتی کرتا نظر آرہا تھا۔ ہوٹل والوں کے لیے ایسے بے میل سیاحوں کی آمدورفت اب عام بات ہو چکی تھی جب کوئی الیکشن ہوتا یا جب کوئی سرکار بدلتی یا جب کابینہ میں توسیع ہوتی تو ایسے ہی جھجکتے ہوئے ہوٹل میں بھیڑ اور بے میل لوگوں کا قافلہ راہداریوں کے آس پاس گھومتا پھرتا نظر آتا۔

حافظ قدرت اللہ بمبئی کی اس رات دیر تک سو نہ سکا۔

پہلے تو اُسے اپنا نہ دادا یاد آیا جس کی چھوٹی سی تصویر لکڑی کے معمولی فریم میں لگا کر اس کے باپ نے ٹانگ رکھی تھی۔ عظمت اللہ خاں۔ بڑی بڑی مونچھیں، رعب دار سرسید والی داڑھی، بھاری بھرکم تن و توش۔ اسے کچھ یاد نہیں۔ اُس نے تو بہت بچپن میں نوّے برس کے عظمت اللہ خاں کو بسترِ مرگ پر اپنے گھر کے اُس کمرے میں پڑا دیکھا تھا جس کی باہری دیواروں پر

آج فلموں کے پوسٹر لگائے جاتے ہیں اور جس کے عوض اُس کے چچا کو فری پاس دیے جاتے تھے اور جن پاسوں کو چُرا کر اُس کے چچا کے جوان لڑکے محلے کے اوباش لونڈوں کے ساتھ رات ایک بجے سینما دیکھ کر گھر آتے اور بازپرس پر ماں بہن کی گالیاں بکتے تھے۔

ہوٹل کی کھڑکی سے جو غالباً ساتویں منزل پر کھلتی تھی نہ جانے کہاں سے یک بارگی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور قدرت اللہ کو اسلام نگر کے اُس پار بہنے والی ہلالی ندی کی میٹھی ہواؤں کی یاد دلا گیا۔

دوست محمد — گھوڑے کی پیٹھ پر راتیں کاٹ دینے والا وہ جنگ جو، خود دار اور غیور پٹھان دوست محمد۔ شیر کی کلائی، چیتے کی کمر اور عقاب کی آنکھوں والا وہ سخت کوش سپاہی جب اس سرزمین پر اُترا تھا اور جب اُس کے گورے چِٹے، خوب رو، خوش جمال اور خوش خصال منصب داروں نے یہاں کے بڑوں کے جھاڑ جھنکاڑوں کو اپنی تلواروں سے کاٹ پھینکا تھا تو انھیں میں کہیں الحاج مولوی حافظ قدرت اللہ ندوی کا پردادا بوڑھے عظمت اللہ خاں کا جدِ امجد اپنے تھکے ہارے، پسینے میں نہائے، کوچ پر کوچ کر کے مسافت طے کرنے والے جفاکش اور وفا شعار گھوڑے کی پیٹھ پر سے زین اُتار رہا تھا اور اُس کی کمر سے اتری ہوئی فاتح اور سرخ رو تلوار درخت کی ایک نچلی شاخ پر لٹکی تھی اور ہلالی ندی کے بے پناہ جنگلوں سے آنے والی مامتا بھری ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔

اور پھر

اور پھر
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
۹۰ سے اوپر کا سِن
مرتعش اعضا
ٹمٹماتی ہوئی اندر گھسی آنکھیں۔ موت کا منظر۔ عظمت اللہ خاں۔
یوپی کے اشفاق اللہ خاں کی طرح اُس دن سر پھرا ہو گیا جب اُس نے بیتوں کے جنگلوں میں انگریز بہادر کی کاٹی ہوئی لکڑیوں میں ایک آدی باسی کو آگ لگاتے دیکھا تھا۔
یہ جنگل ہمارے ہیں۔
ہمارے جنگلوں سے انگریز منافع کماتا ہے۔ ہم انگریزوں کو اپنے جنگل نہیں بیچنے دیں گے۔ عظمت اللہ کی نسوں کا خون اُبل پڑا۔
ترکِ موالات۔ ۴۲ کے ہنگامے۔ عظمت اللہ بھی جنگلوں میں کئی لکڑیوں کو آگ دکھانے لگا۔ کسی نے یہ نہ جانا کہ عظمت اللہ کہاں جاتا ہے کیا کرتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کو کبھی کوئی تامر پتر بھی نہیں ملا۔
بوڑھا عظمت اللہ خاں۔ الحاج مولوی قدرت اللہ ندوی کا جدِ امجد بھلا یہ کب جانتا تھا کہ ایک دن یہ جنگل ہندوستانیوں کے ہو جائیں گے اور تب جنگلات کو خاکستر کرنے والے عظمت اللہ خاں کا اپنا لڑکا اُن کا اپنا خون ان ہی جنگلات کی لکڑیاں چرا چرا کر بیچے گا اور چوری کی کمائی سے شہر کے مختلف حصوں میں پلاٹ پر پلاٹ خریدے گا۔

اُدھر فارسٹ افسروں کو نذریں گزرتی رہیں۔ ادھر عظمت اللہ کا پوتا قدرت اللہ علم دین کے حصول میں استنجے کا ڈھیلا ہاتھ میں پکڑے شرعی پاجامے کا ازار بند کھولتا اور بند کرتا رہا۔

اُدھر چوری کی لکڑی کے ٹرک دن دہاڑے اترتے رہے۔

اور اِدھر قدرت اللہ کا باپ کبھی فرنیچر اور کبھی بیوی بدلتا رہا۔

باپ کہتا تھا قدرت اللہ میرے بھروسے مت رہنا۔ میں ایسے باپ کی اولاد ہوں جس نے میری مسیں بھیگتے ہی مجھ سے کہا تھا بس اب اپنی دنیا آپ بناؤ۔ میں نے خوانچے لگائے، حمالی کی، لیکن ہاتھ نہیں پھیلایا۔ قدرت اللہ چھٹپٹا کر رہ گیا۔ سوتیلی ماؤں کی سرد مہری اور سوتیلے بھائیوں کی کج خلقی باپ کا دو نمبر کا پُراسرار دھندا۔ ایک دن قدرت اللہ باپ سے بھڑ گیا۔

باپ بھی غصّے سے لال ہو گیا۔

"میں چور ہوں ـــــ یہ بتا کہ ایمان دار کون ہے؟ مجال ہے کہ ایک تنکا جنگل سے نکل آئے۔ مگر اتنے پہرے پر بھی لکڑی آتی ہے اور آتی رہے گی۔ میں نہیں خریدوں گا تو میرا پڑوسی خریدے گا۔ ایمان دار کون ہے؟ پتہ ہے تجھے دفتروں کے آرڈروں میں کتنے حصّے لگتے ہیں۔ مجھے ایمانداری مت سکھا۔ شکر ادا کر کہ تیرے باپ کی اتنی مان دان ہے۔ ورنہ اس کام میں بھی کُھلے خزانے ہندو مسلمان کا چکر چل رہا ہے۔ نہ دس ٹرک اُٹھالیں تو پوچھا نہیں میاں لوگوں کے یہاں دو ٹرک اُترے کہ بھنویں سکڑنے لگتی ہیں۔ تجھے ایماندار بننا ہے تو اپنا راستہ ناپ۔

اور اسی روز قدرت اللہ نے باپ سے قطع تعلق کر کے اپنا راستہ ناپ لیا تھا۔ تنہائی کی وہ رات، نیند کوسوں دُور۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس نے اپنے سرھانے رکھی مولانا آزاد کی ترجمان القرآن کی پہلی جلد کے صفحات کو اُلٹنا پلٹنا شروع کر دیا تھا۔ جس صفحے پر اُس کی نظریں ٹھہریں اس پر حدیث قدسی تحریر تھی کئی بار وہ اس تحریر کو پڑھ چکا تھا۔

"اے میرے بندو اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اُس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔

اے میرے بندو اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور جن اُس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔

اے میرے بندو۔ اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اُس کی منھ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت اور بخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کسی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔

اے میرے بندو یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جنھیں میں تمھارے لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر اُنھیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمھیں

واپس دے دیتا ہوں۔"

انضباط ؟

قدرت اللہ نے کروٹ بدلی جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔

انضباط یعنی ضابطہ ــــ یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو تمھارے لیے ضابطہ ہیں۔ تمھاری نگرانی ہیں۔

قدرت اللہ کا گلا رندھ گیا اور وہ گھٹی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"اے پالنے والے میں تری شان ربوبیت کے قربان۔ کیسے کیسے غاصب راتی راتا اہلِ دول بن گئے۔ انھوں نے یتیموں اور بے کسوں کا مال دابا اور اپنے صدر دروازوں پر ھٰذا مِن فضلِ ربّی کا کتبہ نصب کیا۔ ان نو دولتوں کی بھیڑ میں مجھے میری پہچان بتا۔ مجھے میری شناخت عطا کر۔

بمبئی کی رات۔ کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے۔ وہ ہاتھ جو ایک رات اپنی شناخت کے لیے گڑگڑا کر دعا کے لیے اُٹھے تھے آج پنج ہزاری ہوٹل کے نرم نرم بستر استراحت پر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

سویرے ہوٹل کے منیجر کو ایک فون ہوا۔ پوچھا گیا۔

"آپ کے کمرہ نمبر 360 میں کچھ میاں لوگ ٹھہرے ہیں"

"جی میاں لوگ" منیجر حیرت سے بولا۔ پھر سنبھلا۔ "اچھا اچھا میاں لوگ؟ ہاں ٹھہرے ہیں۔"

"اُن سے بول دیجیے۔ دوپہر کا کھانا انھیں منتری جی کے ساتھ کھاتا ہے۔" اور ٹیلیفون رکھ دیا گیا۔

دن چڑھ آیا تھا ــــ قدرت اللہ نے جب ہنڈیا سے کُلی کرکے مُنہ صاف کیا تو اُس کے چہرے پر تازگی تھی۔

"اے میرے بندو۔ اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اُس کی مُنہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت اور بخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کسی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔"

باپ سے علیحدہ ہو کر جب قدرت اللہ بیچارہ آسمان سے گرا تو ببول میں اٹک گیا۔ اُسے سیاست کے پیشہ ور کھلاڑیوں نے لپک لیا۔ پارٹی کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ کیونکہ پارٹیاں تو بیچاری تیس پینتیس سال میں جو کچھ حاصل کر پائی تھیں وہی واپس لوٹانے کا کام کر رہی تھیں اس لیے سب سے پہلا کام پارٹی نے یہ کیا کہ مولوی قدرت اللہ ندوی کو حج کرنے بھیج دیا اور واپسی پر پارٹی کی تبلیغ کے کام پر لگا دیا۔

تب سے قدرت اللہ کی بیوی بھوپال کے ایک پامال محلے میں اپنے بچوں کو ایک وقت بھینسے کی بوٹیاں اور ایک وقت تورکی دال اور چاول کھلاتی ہے۔ خالی وقت میں کھڑی چا۔ پائی پر بیٹھ کر بڑی لڑکی کے سر کی جوئیں دیکھتی ہے۔ لڑکا پاس کے نل سے دن میں دو وقت پانی بھرتا ہے۔ گھر کے دروازے

پر ٹاٹ کا پردہ، چھوٹے سے آنگن میں ایک سائبان سے اٹھتا گیلی لکڑی کا دھواں۔ دن کی تھکن، رات کی گسلمندی۔ ننھی ننھی خوشیاں، ننھے ننھے غم۔

قدرت اللہ بے چارہ دن میں اپنے پارٹی لیڈر کے بچوں کی جوتیاں گانٹھتا ہے۔ آنے جانے والوں مہمانوں کا سامان رکھتا اور اٹھاتا ہے اور شام کو پارٹی کا اخبار لکھتا ہے جس کی سرخیاں اس طرح ہوتی ہیں:

"جہاں ہندو پٹیں وہاں فساد پاکستانی ایجنٹوں نے کرایا

جہاں میاں لوگ پٹیں وہاں فسادات کی ذمہ داری اللہ میاں پر ہے۔"

لکھنے کی سب کو آزادی تھی اس لیے سب اپنی اپنی جگہ لکھ رہے تھے۔

کشمیر کشمیریوں کا ہے۔ بنگال بنگالیوں کا ہے۔ بہار بہاریوں کا ہے، آسام آسامیوں کا ہے، خالصتان سکھوں کا ہے، پاکستان مسلمانوں کا ہے، رہ گیا ہندوستان تو ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ یہ بات بعد میں دیکھی جائے گی کہ مسلمانوں کے پاکستان میں شیعوں کا پاکستان کتنا ہے اور سنیوں کا پاکستان کتنا، ہندوؤں کے ہندوستان میں پنڈتوں کا ہندوستان کتنا ہے اور شودروں کا کتنا۔

تاریخ کو بہت سے فیصلے کرنا ہیں۔ پہلے بھی کر چکی ہے، آگے بھی کرے گی۔

قدرت اللہ کے دفتر کے پڑوس میں مسلم نسواں اسکول میں استانی جی کی آواز آرہی تھی جو سر سے دوپٹہ اوڑھے نویں جماعت کی لڑکیوں کو اردو پڑھا رہی تھیں۔

"اے آبِ رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟"

لڑکیاں ایک ساتھ لحن میں دہرا رہی تھیں۔
"اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو:
آب رود گنگا
قدرت اللہ مارے غصّے کے کانپنے لگا، تب ہی اُس کی نظر اُردو کے مقامی اخبار پر پڑی جس پر لکھا تھا:
"مدھیہ پردیش حکومت نے اُردو اکادمی کا سالانہ بجٹ ۲۵ ہزار سے بڑھا کر پانچ لاکھ کر دیا ہے۔"
قدرت اللہ نے اخبار کی سرخیوں پر اُچٹتی سی نظر ڈالی
"یوسف سیٹھ کے صاحبزادے کے عقیقے پر محفل مشاعرہ۔
گوشۂ تبصرۂ ادب کا پانچواں اجلاس (چائے کے ساتھ ناشتہ بھی ملے گا)
مناسب معاوضہ پر اصلاح کے لیے غزلیں اس پتے پر بھیجیں۔"
بچیاں اب بھی گا رہی تھیں:
"اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا"
ٹیلیفون پر کی گئی ہدایت کے مطابق قدرت اللہ منتری جی کے ساتھ جب کھانا کھا چکا تو اُسے پھر ہدایت کی گئی کہ منتری جی نے اُسے اندر کے کمرے میں بلایا ہے۔
دراصل بمبئی گھومنے کا یہ شاندار موقعہ اُسے منتری جی کے طفیل میں ہی ملا تھا۔ منتری جی بمبئی کیوں آئے تھے یہ جاننا اُس کے لیے ضروری نہ تھا۔ اُسے

حکم ملا تھا کہ بھوپال سے بمبئی چلا جائے۔ چاہے تو بچوں کو بھی گھما لائے۔ بمبئی نے کھائے اور اُس کے ساتھ وغیرہ وغیرہ کے معاملات غیبی طور پر پورے ہو رہے تھے۔ قدرت اندر گیا۔ دیکھا ہزاروں روپے میز پر گڈیوں کی شکل میں پڑے ہیں۔

"یہ ساٹھ ہزار روپیہ ہے' اسے سنبھال کر رکھو۔" منتری جی بولے۔

قدرت سمجھ گیا کہ منتری جی بمبئی کیوں آئے تھے۔ بولے۔

"تمھیں یہ روپیہ چناؤ جیتنے میں امیدوار کو پہنچانا ہے۔"

"جی ___"

"اُن سے کہنا ہمارا کینڈیڈیٹ جیتنا نہیں چاہیئے۔"

"جی کسے جیتنا نہیں چاہیئے۔"

"رام دھن گوسوامی کو ___" جواب ملا۔

گوسوامی اُن کی ہی پارٹی کا آدمی تھا۔ بڑا نیک بڑا ایماندار۔ پچھلے تیس سال سے بال بچوں کو چھوڑ کر پارٹی کی چوکھٹ پر سو رہا تھا۔ اُسے ٹکٹ ملا تو لوگ خوش ہوئے تھے۔ امیدوار اُس کا حریف تھا۔

"یہ آپ کیا کہلوا رہے ہیں۔ وہ تو اپنی پارٹی کا آدمی ہے" ___ قدرت اللہ بولا۔

"صرف کہلوا ہی نہیں رہا ہوں بلکہ اس کام کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ بھی بھیج رہا ہوں۔"

"اپنی پارٹی کے آدمی کو آپ ہرانا چاہتے ہیں۔"

"اپنی پارٹی کا ہے پر اپنے گروپ کا نہیں ہے میاں جی۔"
"مطلب؟" قدرت اللہ کے منہ سے نکل گیا۔
"اگر تم چاہتے ہو کہ ہم مکھ منتری بنیں تو گو اسے اِی کا ہارنا ضروری ہے۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"ستا خالی پارٹی سے نہیں اپنے لوگوں سے ملتی ہے۔ ہم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہیں جنھیں ستا میں ٹکنا ہوتا ہے اُن سب کو یہی کرنا پڑتا ہے۔"
پھر منتری جی نے تھوڑا توقف کیا اور بُرا سا مُنھ بنا کر بولے۔
"مارشل لا ہی چلانا جانتے ہو، آخر تم میاں لوگ پرجا تنتر چلانا کب سیکھو گے۔"
قدرت نے چپ چاپ بریف کیس میں نوٹ بھرے اور رات کی گاڑی سے مع بچوں کے بمبئی چھوڑ دیا۔ گھر پر بیوی بچوں کو اُتارنے کے بعد اُس نے امجد بابو کی میز پر بریف کیس خالی کر دیا۔
اس چناؤ میں محمد بیگ کو خاص طور پر تقریر کرنے کو بلایا گیا تھا۔
وہ ووٹروں کو خطاب کر رہے تھے۔
"زرا اس دلھن کو دیکھو جس کا دولھا گھوڑے پر بیٹھ کر اور سات پھیرے ڈال کر اسے بیاہ لے جانے والا ہے۔
جس قالین پر وہ بیٹھی ہے اُس کے تانے بانے مسلمان کاریگروں نے ڈالے ہیں۔
جو ساڑی اس کے بدن پر لپٹی ہے اُسے بنارس کے مسلمان بُنکروں نے

بنا ہے۔

سہاگ کی جو چوڑیاں وہ پہنے ہے انھیں فیروز آباد کے مسلمان شیشہ گردوں نے تیار کیا ہے۔

مراد آباد کے مسلمان کاریگروں نے اُس کے برتنوں کو نقش و نگار عطا کیے ہیں۔ جو تالا اس نے اپنے بکس میں ڈالا ہے اُسے علی گڑھ کے مسلمان کارندوں نے بنایا ہے۔

اُن کے ہاتھ کٹیں گے تو یہ دلہن کیسے سجے گی۔

سیاست نہ ہندو ہوتی ہے اور نہ مسلمان کہ وہ خود ایک مذہب ہے۔

جو ۱۹۴۷ء میں قالین بناتے تھے آج بھی قالین بناتے ہیں۔

جو تب ساڑی بنتے تھے آج بھی بنتے ہیں۔

آج بھی اُن کے مال کو اونے پونے خریدنے والے منافع خور نچوڑ لئے دے رہے ہیں۔

کدھر سے جاؤ گے۔ ساری راہیں مسدود ہیں ـــ کوئی بیچارہ جسے تقریریں سُن کر اکثر متلی ہو جایا کرتی تھی۔ بول پڑا۔

"ارے خان بھائی میاں کبھی کبھی اپن کو بڑی زور کا پنا ما آتا ہے۔"

جس کے جواب میں کسی نے لقمہ دیا۔

"حضور نے فرمایا ہے۔ پتناتے کی پلیٹ کو ہمیشہ ٹھنڈی کر کے کھاؤ۔"

"مگر میں کہہ رہا ہوں کب تک ٹھنڈی کرو گے خان۔ جب مکھیاں بھنکا لیں اور تب کھایا تو ایسا کب حضور نے کہا ہے۔

ہر کام کے لیے اپیلیں، ہر معاملے کے لیے تحقیقاتی کمیشن، ہر سفارش کے لیے کمیٹیاں اور پھر رپورٹیں اور پھر اپیلیں اور پھر تحقیقات اور کمیٹیاں اور پھر سفارشات۔ قوم کے ہاتھ میں پتاشے کی پلیٹ ہمیشہ ٹھنڈی کر کے ہی پکڑائی جاتی ہے۔ وہ اُسے مزید ٹھنڈی کرتی ہے۔ پھر اس پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ تب کھائی جاتی ہے۔ کسی کو غصہ نہیں آتا۔

جو غصے میں ہے وہ بھی ٹھنڈا

جس پر غصہ ہو رہا ہے وہ بھی ٹھنڈا۔

جو غصہ دیکھ رہا ہے وہ بھی ٹھنڈا۔

پیسے والے مسلمان ٹھیکیداروں میں قدرت اللہ کے باپ کا بڑا نام شہر میں تھا۔

ویسے سارے ٹھیکیداروں میں بڑی مماثلت تھی۔

سارے ٹھیکیدار ایک ہی اُردو کا اخبار پڑھتے تھے۔

سب کے چونے میں بالائی پڑتی تھی۔

سب کے کُرتے پانوں کی پیکوں کے دھبوں سے داغدار تھے۔

سب کے دلوں میں خوف خدا تھا اس لیے سب بعد نماز جمعہ ایک روپے کی ریزگاری خیرات کرتے تھے۔

ایک رات جب قدرت اللہ اپنی بیوی کے ساتھ سو رہا تھا تو اُسے خبر ملی کہ اس کے باپ کو دل کا دورہ پڑ چکا ہے اور وہ اسپتال میں بھرتی ہے۔

بیوی نے بہت کہا کہ وہ باپ کو جا کر دیکھ آئے۔۔۔ قدرت اللہ کروٹیں بدلتا رہا۔

ابا تم نے مجھے کیا دیا۔
ابا تم نے خود کیا پایا۔

ابا تم کہتے رہے کہ مسلمانوں کا مستقبل کانگریس کے ہاتھ میں ہے۔ بتیس برس تک تم نے کھدر پہنا، جلسوں میں دریاں بچھائیں۔ دو بار تمھارے پیٹھے میں آگ لگی۔ دوسری بار کریم الدین قصائی کا اوباش لونڈا پکڑا گیا۔ تم سمجھ رہے تھے کہ وہ کسی ہندو کا کام ہے۔ جب کہ اُس کے پیچھے ممتو خاں ٹھیکیدار کا ہاتھ تھا۔ تم کو چکر آ گیا تھا۔

ابا تم کو بھی عام مسلمانوں کی طرح اپنے آپ کو مسلمان بھارتی کہتے اچھا لگتا تھا۔ میں تم سے کہتا تھا کیوں کوستے ہو حالات کو، تم جمہوری ملک کے آزاد شہری ہو۔ تم مسلمان بھارتی نہیں بلکہ تم بھارتی مسلمان ہو۔ مگر ابا یہ سُن کر تم کو غصہ آ گیا تھا اور تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔

" تو اپنے کو کیا سمجھتا ہے "

" میں اپنے کو بھارتی مسلمان سمجھتا ہوں یعنی میں پہلے بھارتی ہوں اُس کے بعد مسلمان۔"

ابا اُس دن جمعہ تھا۔ تم نماز پڑھ کر واپس آئے تھے۔ تم نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ تمھاری آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے۔ تم دھیمے سے بولے تھے۔

" بیٹا ہم بھارتی نہ بن سکے لیکن اس جُرم کے ساتھ ہمیں یہ ندامت بھی

ہے کہ ہم مسلمان بھی نہ بن سکے۔ بس اتنا اطمینان ضرور ہے کہ دولت کے پیچھے بھاگتی اس دنیا میں ہم بھی دس پانچ لاکھ چھوڑ کر ہی جائیں گے۔ بیٹا ہماری چھت مضبوط تھی اور ہمارا دسترخوان لذت بخش۔ ہماری تو کٹ گئی اب تمہارے دن آئے ہیں ــــ تم مسلمان بننے چلے تھے۔ مولوی ہوئے، حافظ بنے، اب بھارتی بننا چاہتے ہو۔ خدا تمھیں بھارتی بننا نصیب کرے۔ مگر میرے بیٹے مجھے تو دنیا نے یہی سکھایا ہے کہ جس کے پاس دولت ہے اُس کے پاس مذہب بھی ہے اور اُس کے پاس ملک بھی۔ اُس کے پاس تہذیب بھی ہے اور اُس کے پاس سیاست بھی۔"

قدرت اللہ کا باپ وارڈ کے ایک پلنگ پر اپنے دل پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُس کے ہوش و حواس لوٹے تھے۔ اُس نے اپنے چاروں طرف کھڑے عزیزوں کو دیکھا تھا۔ سب تھے قدرت اللہ نہیں تھا۔ کسی نے اس سے دھیمے سے کہا۔

"قدرت کو بلا لو، اُسے بھی دیکھ لو۔"

قدرت اللہ کے باپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں جی تو اُس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔" اندر سے دل بولا ــــ "کون ہے وہ میرا۔ میرے نطفے سے ہوتا تو جان دے دیتا مگر مولوی فاضل ہو کر اوروں نوکروں کی طرح ہندو آقاؤں کے گھروں کی سبزیاں نہ خریدتا پھرتا۔ اپنا نسلی وقار، اپنے خاندان کی آن کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ اسنے کس طرح اکڑ کر بولا اُس روز۔

"تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ پارٹی میں نیچے سے اوپر جانے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"
"مگر تیری پارٹی مسلمانوں کی دشمن ہے۔"
"وہ دن گئے ابا مسلمانوں سے دشمنی کر کے کوئی پارٹی پنپ نہیں سکتی۔"
"مگر تیری پارٹی میں گنڈے پائے جاتے ہیں۔"
"دیکھو ابا ہماری پرجاتنتر میں گنڈوں کے بنا کسی پارٹی کا کام ابھی کچھ دن اور نہیں چل سکتا۔"
"تو تو کیا چاہتا ہے ___؟"
"کاٹنا ___" قدرت ڈھٹائی سے بولا ___ "جنگل کاٹنا چاہتا ہوں۔"
باپ کے دل کو چوٹ لگی۔ تڑپ کر بولا۔ "کیا بکتا ہے قدرت"
اور قدرت بکتا چلا گیا۔ "جب تک کمزور رہو، دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ بے ضمیری کی چادر میں ساری کمزوریاں چھپ جاتی ہیں۔ بڑے لوگ کم ہیں، زیادہ تعداد عام لوگوں کی ہے۔ ان عام لوگوں کی زندگی میں بھی ایک دو موقعے آتے ہیں جب وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔
جو صحیح وقت میں صحیح طور پر صحیح جگہ اس موقع کو پالیتا ہے وہ اپنی ناداری سے چھٹکارا پالیتا ہے اور بعد میں اپنی ناداری کی کہانی دوسرے ناداروں کو چٹخارے لے لے کے سناتا ہے۔ قدرت نہ تو اتنی فیاض ہے اور نہ اتنی بالمدار کہ سب کو چنگیز بنا دے۔ عظیم صلاحیتوں کا خزانہ محدود ہے۔ میراتھان میں حصہ لینا سب کے بس کی بات نہیں۔ جو بازو والی گلی سے نکل جائے وہ کھلاڑی

___ اب تمہاری شان، تمہارا عیش آرام، تمہاری دریاں، تمہارے قالین، تمہارا دسترخوان اور تمہاری ضیافتیں، جنگل لگانے پر نہیں، جنگل اجاڑنے پر قائم ہیں۔

اس لیے کاٹو کاٹو

ہواؤں نے کہا۔ دیکھو ہم سوکھ جائیں گے اور پھر لُو چلے گی۔

مگر جنگل کٹتا رہا

بادلوں نے کہا۔ ہمیں کون روکے گا۔ دیکھو ہم برسنا چھوڑ دیں گے۔

مگر جنگل کٹتا رہا۔

زمین نے کہا۔ ہم پیاسے مرے تو ایک اکھوا بھی دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔

مگر جنگل کٹتا رہا۔

کل کے موسم کل آئیں گے، آج کی رت تو اپنی ہے۔

ہم سب اپنے اپنے جنگل کاٹ رہے ہیں۔

ہوائیں دھیرے دھیرے سوکھ رہی ہیں۔

بادل اوپر سے نکل جاتے ہیں۔ برستے نہیں۔ زمین العطش العطش پکار رہی ہے۔

لیکن اب بھی کچھ جنگل موجود ہے اس لیے کاٹو کاٹو۔ میرا تمہارا دونوں میں حصہ لینا سب کے بس کی بات نہیں۔ جو بازو والی گلی سے نکل جائے وہی کھلاڑی۔

اس لیے ___

کاٹو اور کاٹو ___ جنھیں کل جنگل کی ضرورت ہو گی، وہ پھر جنگل اُگا لیں گے۔

... بیوی نے بہت چاہا کہ قدرت اللہ باپ سے مل آئے۔ جب وہ نہیں گیا تو وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ قدرت کچھ دیر سناٹے میں بیٹھا رہا۔ آخر کو قدرت اللہ نے کاغذ پر ایک بڑی سی، موٹی سی اور بھدی سی گالی لکھی، پھر بہت دیر تک اس گالی کے حروف پر قلم پھیر پھیر کر اُسے خوشنما اور دیدہ زیب بناتا رہا اور مختلف زاویوں سے اُس میں روشنائی بھرتا رہا۔ آخر کو اُسے بہت زور کا پتنا آیا اور وہ آڑی ترچھی لکیروں سے اُسے کاٹنے لگا۔ باریک لکیریں جب اُس گالی کو چھپا نہ پائیں اور وہ لکیروں کے پس منظر میں بھی اُسی طرح نظر آتی رہی کہ پڑھی جاسکے تو اُس نے اس پتنائے میں کاغذ ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ قدرت اللہ کے پتنائے کی پلیٹ بہت دیر سے ٹھنڈی پڑی تھی لیکن وہ پھٹے ہوئے کاغذ کے پرزوں کے درمیان پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اور اُس کے باپ کا جنازہ قبرستان جا رہا تھا۔

جنگل کٹ رہے ہیں (۲)

آدمی کو ہر دم اور ہر گھڑی چوکس اور چوکنا رہنا چاہیئے۔ یہ بات قدرت اللہ کی سمجھ سے بہت پرے تھی۔

عام طور پر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اُن کے آگے بھی آدمی ہیں اور پیچھے بھی آدمی ہیں۔ اُسی طرح جس طرح قوموں کے آگے بھی قومیں ہیں اور پیچھے بھی قومیں ہیں۔

قدرت اللہ کا باپ جو دل کے دورے میں مر گیا اُتنا ضرور جانتا تھا جتنا اُس کے لیے جاننا ضروری تھا۔ عظمت اللہ اپنے ساتھ اپنا سامان قبر میں لے گیا، پھر قدرت اللہ کی سمجھ سے جو بات پرے تھی وہ کب تک پرے رہتی کہ دُور کہیں سونے کا ایک شہر ہے جس کا صدر دروازہ صرف ایک ہے اور چور دروازے بہت ہیں اور سونے کے اس جگمگاتے شہر میں داخل ہونے کا راستہ مسلسل تلاش کیا جاتا رہا ہے کہ آگے بھی آدمی ہیں اور پیچھے بھی آدمی ہیں۔

قدرت اللہ کے دادا نے جو علم سیکھا تھا وہ قدرت اللہ کے باپ کے کام نہ آیا۔ قدرت اللہ بھی اپنا علم آپ حاصل کر رہا تھا۔

اُس کے پاس علم ہی علم تھا کہ پوری بستی میں گرتی ہوئی خمیدہ کمر عمارتیں تھیں، اندھیری گلیاں تھیں، گلیوں کی طرف کھلنے والے سنڈاس کے منھ تھے اور اُن میں بجبجاتے ہوئے کیڑے تھے اور سوئی سوئی بسیجیں تھیں اور کھچی کھچی شاہیں تھیں اور دو مسجدیں تھیں اور مسجدوں میں مؤذن تھے اور مؤذنوں کے سامنے لاؤڈ اسپیکر تھے اور لاؤڈ اسپیکر کے سامنے برقعہ والی عمر رسیدہ بیوائیں تھیں، ٹاٹ کے پردے تھے۔ پردوں کے پیچھے کھتے کھتے کھانے والی جوان لڑکیاں تھیں جو مڈل سے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ وہ اوباش لونڈے تھے جو نہ مسجدوں کے کام کے تھے اور نہ اسکولوں کے، نہ کارخانوں میں جاتے تھے اور نہ دکانوں پر بیٹھتے تھے۔ گندے گندے چائے خانوں میں اونگھتے ہوئے وہ سیدھے سادے مسلمان تھے جو دفتروں میں بابو تھے یا چپراسی، کچہریوں میں منشی تھے یا میونسپلٹی میں پلمبر، سائیکل کا پنکچر بناتے تھے یا گیراجوں میں گاڑیاں دھوتے تھے۔ بسوں میں جیب کاٹتے تھے یا سنیما کے ٹکٹ بلیک کرتے تھے۔ پرائیویٹ ڈاکٹروں کے کمپاؤنڈر تھے یا کمپاؤنڈری کرتے کرتے خود ڈاکٹر بن گئے تھے۔ پھر قصائی تھے، بکر قصاب تھے، سبزی فروش تھے، جوتے بنانے والے کاریگر تھے۔ جلد ساز تھے، دفتری تھے، اسکوٹر مکینک تھے۔ حلوائی تھے، پھاملی تھے، پرچون کے دکاندار تھے۔ پتلی پتلی گلیاں اور کوچے تھے، کوچے کے مکانوں کی چھتوں سے اُٹھتا ہوا گیلی

لکڑیوں کا دھواں اور نیم کے چند درخت تھے اور درختوں کی شاخوں پر جھولتی ہوئی غمگین شامیں تھیں اور شاموں کے جھٹپٹے میں بسیرے کو لوٹتے ہوئے بے شمار پرندے تھے ــــ اور انھیں درختوں کے اُس پار اجڑی ہوئی مفلس اور مدقوق بستی میں ایک بے جوڑ اور بے میل کوٹھی تھی کہ رنگ جس کا زعفرانی تھا جس میں محرابیں تھیں، کنگورے تھے، قدآدم بلجیم کے شیشوں کے در تھے، بڑے بڑے جھاڑ فانوس تھے۔ سبزہ تھا، کیاریاں تھیں، کیاریوں میں ست رنگے پروں والے مور ناچتے تھے اور کوٹھی کے صدر دروازے پر ھٰذا من فضل ربی کا کتبہ تھا اور نیچے پورٹیکو کے سامنے اندر جاتی ہوئی ایک گیلری تھی اور گیلری میں گرمی سے زبانیں نکالے، ہانپتے ہوئے بھاری جبڑوں والے کتے تھے اور کتوں کی سیرگشتی کے لیے بہت بڑے احاطے کے بعد چہار دیواری تھی اور چہار دیواری کے درمیان استادہ زعفرانی کوٹھی کا ایک پچھواڑہ تھا جو اپنی گندگی اُس بستی کی طرف پھینکتا تھا جدھر نیم کے درخت تھے اور دو مسجدیں تھیں اور مسجدوں میں مؤذن تھے اور مؤذنوں کے سامنے لاؤڈاسپیکر تھے اور لاؤڈاسپیکروں کے سامنے مولوی قدرت اللہ کا گھر تھا اور گھر کی دہلیز پر ایک ستر سالہ بے آسرا مسلمان فقیر کی صدا تھی جو درد بھری آواز میں مولانا روم کی مناجات کا شعر پڑھ رہا تھا

آنکہ لطف خویش را اظہار کرد
با خلیلش نار را گلزار کرد

وہ باپ جس نے قدرت اللہ کو گھر سے یہ کہہ کر نکال دیا تھا کہ وہ جانتا

اور مولوی ہو کر ہندو آقاؤں کی جوتیاں سیدھی کرتا ہے، جب مر گیا تو قدرت اللہ نے پلنگ پر پڑے پڑے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر موٹی سی اور بھاری سی گالی لکھی تھی۔ گالی کے الفاظ اس قدر خوش شکل تھے جتنی خوش شکل اس کی جوان، خوش شکل سوتیلی بہن شوکت جہاں۔ ان لفظوں کی گولائیاں شوکت جہاں کے جسم کی گولائیوں کی مانند پُرکشش تھیں اور پھر یہ ہوا تھا کہ قدرت اللہ کو بہت زور کا غصّہ آیا تھا اور اُس نے اس گالی پر آڑی ترچھی لکیریں بنا کر اُسے کاٹنے کی کوشش کی تھی تا کہ وہ گالی پڑھی نہ جا سکے۔ مگر وہ گالی ان لکیروں کے پیچھے سے بھی صاف پڑھی جا سکتی تھی اسی طرح جس طرح زعفران کوٹھی کے احاطے میں پائی جانے والی جگہ جگہ سے کٹی پٹی لاش آسانی سے پہچان لی گئی تھی کہ وہ شوکت جہاں کی لاش ہے۔

پولیس کی جیپوں کے سائرن

ریوالور

ہلچل، ہنگامہ

سیاسی قتل ـــــ اور پھر کوٹھی کے مکینوں کو پھنسانے کی کوشش۔

شوکت جہاں ـــــ!

جس کا رویاں بھی دُکھتا تو قدرت اللہ کا باپ تڑپ اُٹھتا۔ دوسری بیوی کے پیٹ سے ہونے والے بچوں میں سب سے چہیتی اولاد شوکت جہاں۔

قدرت اللہ کے باپ کی آنکھوں میں شوکت جہاں اُس کی خیالی ہیروئن تھی:

رات رات بھر جاگ کر ایم۔ اے کی تعلیم پائی۔
جوڈو کراٹے سیکھا۔ تو کبھی تیراکی میں حصہ لیا۔
اُجلی اُجلی سی تھرکتی آنکھوں والی۔ نکلتا ہوا قد، قدموں سے لپٹ لپٹ جانے والی فتح اور کامرانی بھری چال، بے باک۔ آواز میں چونکا دینے والی حرارت بھری ایک لذت بخش کھنک۔
مسکراتی تو گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے۔ قاتلوں کے چھکے چھوٹ گئے ہوں گے۔ شاید وہ اسے مرنے کے بعد بھی کاٹتے پیٹتے رہے تھے۔
بیٹی نے آنکھیں کھول کر باپ کو کانگریس پارٹی کے جلسوں میں رسی بھانجتے دیکھا تھا۔

نیتاؤں نے شوکت جہاں کو سمجھایا، مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی حالت بڑی خستہ ہے۔ اُن کے درمیان رہ کر اُن کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ الیکشن کے وقت کام بھی آئے گا۔ اور سب سے پہلے چراغ گھر میں ہی جلتا ہے اس لیے کیوں نہ یہ کام اُسی محلے سے شروع کیا جائے جہاں خمیدہ کمر بوسیدہ عمارتیں ہیں، بدبو والی ہوائیں ہیں اور ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے جوان لڑکیاں ہیں اور چائے خانوں میں روز کا کنواں کھودنے والے مسلمان گرہستدار اور مزدور ہیں اور کچھ ہی دور نیم کے درختوں کے اس پار صرف ایک زعفرانی کوٹھی ہے کہ جس کے صدر دروازے پر ھٰذا من فضلِ ربی لکھا ہے اور جس کا مالک شہباز خاں ہے۔
کچھ دنوں شوکت جہاں ایک سیاسی پارٹی کی کھلی جیپ میں پیر گیٹ

اور نئے شہر کے درمیان سڑکوں پر بھاگتی ہوئی دیکھی گئی۔
شوکت جہاں کے نام اُس کا باپ اپنا سارا اثاثہ پہلے ہی کر چکا تھا۔
شوکت جہاں کے پاس یوں تو سب کچھ تھا کہ سب کچھ، سب کچھ نہیں ہوتا۔
منصب، نام و نمود، ہمسایوں میں برتری کے لیے ایک ایسی توقیر جو سب کے پاس نہیں ہوتی، شوکت جہاں کے پاس بھی نہیں تھی۔
وہ چاہتی تھی اخباروں میں اُس کی تصویریں نکلیں، جلسوں جلوسوں میں نامی گرامی لوگوں میں اُس کا اٹھنا بیٹھنا ہو اُس کے دروازے پر جیپوں ڈیمبیسڈرز اور فی ایٹوں کے ہارن بجیں وہ تازہ اور شگفتہ قہقہوں سے چائے کی پیالیوں اور مشروبات کے گلاسوں سے اپنے آرام دہ ڈرائنگ روم میں آنے جانے والوں کا استقبال کرے۔ دبلے، کچلے اور سہمے ہوئے غریب پڑوسی اُسے عزت سے سلام کریں۔
پھر وہ کھدر کی ساری پہننے لگی۔
پھر وہ عوامی جلسوں میں ڈائس پر انتظامات کرتے ہوئے دیکھی گئی۔
پھر وہ فیملی پلاننگ کی حمایت میں مسلمان کرخنداروں کے مجمع میں تقریریں کرنے لگی۔
پھر وہ جھگی جھونپڑیوں میں بچوں کو دودھ تقسیم کروانے لگی۔
پھر وہ فسادات والی امن کمیٹیوں کی ممبر بننے لگی۔
پھر وہ شہباز خاں کو اچھی لگنے لگی، پھر اُس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے پڑنے لگے ـــــ اور پھر وہ قتل کر دی گئی۔

قدرت اللہ کی داڑھی کے کئی بال سفید ہو گئے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں ـــ جب وہ قبر میں اُتاری جا رہی تھی، قدرت اللہ قبرستان میں بیری کے پیڑ کے تنے سے لپٹا ہوا رو رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو بھیا گُڈو کی شادی میں کراؤں گی۔"

سوتیلے بھائی بہن کی ہر ملاقات پر بہن کا پہلا جملہ یہی ہوتا۔

ایک رات اُس نے بھائی سے کہا تھا۔

"یہاں کچھ بھی گڑگڑانے سے نہیں ملتا۔ مسلمانوں کے پاس تاج محل تو ہے، گولڈن ٹمپل نہیں ہے ـــ صرف مانومنٹ سے کام نہیں چلتا کہ صرف خوبصورت ہونا کافی نہیں۔ اور پھر حُسن ماضی میں نہیں بلکہ حال میں حسین ہونا چاہیئے۔

"بھیا کوئی اپنے ملک سے نفرت نہیں کرتا۔ ہمیں بھی بہت پیار ہے اپنے ملک سے لیکن اپنے وجود کی سلامتی کے لیے ایک قوت بخش تحریک، ایک غلبہ آمیز مدافعت، ایک جھنجھوڑ دینے والی مہذب مگر تاریخ ساز دیوانگی کی ضرورت ہے، ہٹلر کی نظر جب کمزور ہو گئی تو اُس نے پہلے عینک لگا کر اپنی کمزوری دوسروں کے حوالے نہیں کی بلکہ بڑے حروف کا ٹائپ رائج کروا دیا مجھے پتہ ہے کیسے جیا جانا چاہیئے۔

میرے پردادا کو انگریز اچھے لگتے تھے

"میرے دادا کو گاندھی جی اچھے لگتے تھے۔

"میرے باپ کو نہرو اچھے لگے۔

۲

• گلاب ۔ مجھے کون اچھا لگتا ہے؟

• اندر ہی اندر کہیں اچھا لگتا ہے جیسے میں زور سے اونچی آواز میں نہیں کہہ سکتی ۔ وہ جن معنوں میں دوسرے لوگوں کو اچھا لگتا ہے اُس میں کچھ گھپلا ہے اور میں خود کو اس گھپلے سے بچاتے ہوئے پسند کرتی ہوں ـــــ

• وہ ایران کا بوڑھا خمینی ہے۔

• اس لیے نہیں کہ وہ مسلمانوں کا اسلام واپس لانا چاہتا ہے ۔
میں تو بس اس لیے پسند کرتی ہوں کہ وہ سُنّی اور شیعہ دونوں سے یہ کہتا ہے کہ اُنھیں ایک دوسرے کی مسجدوں میں نماز پڑھنا چاہیے ۔ اللہ ایک ہے، قرآن ایک ہے، نبوّت ایک ہے

"کیا تمھیں نہیں لگتا بھیا کہ جو منتشر ہو چکے ہیں اُنھیں سمٹنا چاہیے اس لیے سمٹنا چاہیے کہ شاید اسی بہانے کوئی بہتری کی شکل نکل سکے۔ مگر یہ بات میں زور سے اس لیے نہیں کہہ سکتی کہ میرے باپ نے جس نہرو سے محبت کی تھی وہ مجھ میں ابھی تھوڑا تھوڑا زندہ ہے ۔ کیا پتہ کل وہ مر جائے اور میں یہی بات زور سے کہنے لگوں ۔ جو لوگ زور سے کہہ رہے ہیں اُن کے یہاں شائد کچھ مر گیا ہے ۔ اُنھیں شائد یہ پچھتاوا نہیں کہ بہ حیثیت مسلمان وہ اپنی پرانی شناخت کھو چکے ۔ وہ تو ہونا تھا ۔ اپنے ملک کو نئے سماجی اور سیاسی معنی دینے کے لیے اتنی قربانی تو ہم کو دینا ہی تھی ـــــ
در حقیقت ہماری اصل پریشانی یہ ہے کہ ہماری نئی شناخت کیا ہے ؟

ہم میں روز بہ روز گیا مرتا جا رہا ہے اس کا پتہ کرنے کی فرصت کس کو ہے ؟ ہم روز بہ روز کتنا کم پا کر کتنا زیادہ کھو رہے ہیں ۔ یہ حساب کتاب کہیں نہیں رکھا جا رہا ہے سماجی انصاف کے رجسٹروں میں بھی نہیں ۔

" لیکن تم فکر مت کرو بھیا ، لکو کی شادی میں کروں گی ۔ "

قدرت حافظ ہوا ، مولوی ہوا ، پھر میلا ایک ایک سیاسی پارٹی کا اخبار لکھنے لگا ۔ بیٹا اس لیے باپ سے ناراض تھا کہ باپ چوری کے دھندے میں جنگل سے چرائی ہوئی لکڑیاں بیچتا تھا باپ اس لیے ناراض ہوا کہ بیٹا بہت زیادہ دین دار ہو گیا تھا ۔ دونوں الگ ہو گئے ۔ مگر شوکت جہاں تب بھی قدرت سے ملتی رہی ۔ بھائی کے لیے سیاست روزی کی مزدوری تھی اور بہن کے لیے ایک شوق تھا ۔ ایک کے لیے یہ تھکن تھی تو دوسرے کے لیے تازگی ۔ دونوں کی پارٹیوں کو مسلمانوں کے ووٹ اور شہباز خاں کے روپے کی ضرورت تھی ۔ "

شہباز خاں جس کے پاس ایک زعفرانی کوٹھی تھی ۔

اور کوٹھی کا پچھواڑہ اُدھر کھلتا تھا جدھر نیم کے کچھ درخت تھے اور درختوں کے اُس پار دو مسجدیں تھیں اور مسجدوں میں جمعہ کے خطبہ کے بعد شہباز خاں کی جان و مال کی دعا کی جاتی تھی کہ شہباز خاں مسکینوں اور یتیموں کی پرورش حاجت مندوں کی حاجت روائی اور بے سہاروں کی کفالت کے لیے مشہور تھا کہ اس کے فرنیچر کے کارخانے میں چوتیس سکھ اٹھائیس ہندو اور پورے دو سو مسلمان کام کرتے تھے اور صرف ۸۰ پیسے میں دوپہر کا لنچ

کارخانے کی کینٹین سے ملتا تھا اور ہر عید پر ۱۵ دن کی تنخواہ ہر ایک کو تقسیم ہوتی تھی اور مسلمانوں کی کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے شہباز خاں کی ملت نوازی پر ہر ایک ایمان لا چکا تھا اور شہباز خاں ویسے ہی بڑا مہربان تھا کہ وہ اُن لوگوں میں تھا جو نہ جانے کب اور کیسے رئیس ہو جایا کرتے ہیں۔

مگر

مگر شہباز خاں اکیلا تھا کہ بیوی مر چکی تھی، اکیلا تھا کہ اس کی واحد اولاد یعنی اُس کی آٹھ سالہ لڑکی پولیو کا شکار ہو کر دہرہ دون کے بورڈنگ میں بیساکھیوں پر چل رہی تھی، بہت خائف تھا کہ دروازے اور کھڑکیاں مقفل کر کے سوتا تھا، ہراساں تھا کہ حسد دنیا میں ہمیشہ کی طرح زندہ تھی اور اُس پر دو بار قاتلانہ حملے کر چکی تھی۔

بھائیں بھائیں کرتی ہوئی کوٹھی کی راہ داریاں۔ غیر آباد مگر سجے ہوئے کمروں کے باریک پردے اور اُن کی سرسراہٹیں، بے کیف سناٹوں میں کبھی کبھی اُس کے کتوں کی غراہٹیں۔ اُسے ہر وقت ایسا لگتا جیسے اُس کے پیچھے کوئی چل رہا ہے۔ اُسے ہر رات اپنے آرام دہ بستر پر لیٹے لیٹے یوں محسوس ہوتا جیسے رات میں جو کچھ وہ کھا پی کر لیٹا ہے وہ دھیرے دھیرے اس کے کلیجے کو کاٹ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں اُسے اُبکائی آئے گی اور اُس کی مسہری کے نیچے دودھیا رنگ کے دبیز قالین پر اُس کا سُرخ سُرخ کلیجہ کٹ کٹ کر گرے گا۔

جس دن شوکت جہاں کی لاش کوٹھی کے احاطے میں پائی گئی اُس کے

کچھ ہی دن پہلے سے کوٹھی کے گورکھا دربان کے ہونٹ سِل چکے تھے۔ اپنے چھوٹے سے کوارٹر میں اُس نے اپنی ادھیڑ عمر کی بیوی اور بچوں کو اپنے درمیان لٹا کر پہلی بار اپنے پُرسکون پہاڑی گاؤں کو ٹوٹ کر یاد کیا تھا — سُکھ اور دُکھ کیا ہے؟

چین سے دو روٹیاں کھا لینے کی تلاش میں بھٹکتا ہوا وہ کس دوزخ میں آن مرا۔

اپنی برفیلی چوٹیاں، اپنے معصوم جھرنے، اپنے گھنے دیودار وں کی چھاؤں، اپنے ننھے منّے سے دُکھ اور ننھے منّے سے سُکھ چھوڑ کر وہ یہاں کیا تلاش کرنے آیا تھا؟ دو روٹیاں؟

"سوال ہندو مسلمان کا نہیں، سوال دو روٹیوں کا ہے اور کارخانے ملت کے ضابطوں سے نہیں، روٹیوں کے اُصول پر چلتے ہیں۔"

گورکھا نے خان میاں کو شوکت جہاں سے کہتے سُنا تھا۔ ملازم شہباز کو خان میاں کہہ کر پکارتے تھے — اُنھوں نے شوکت سے کہا تھا۔

"دیکھو شوکت تمھیں پارٹی کے لیے دس ہزار چاہیئے، لے لو۔ کیوں کہ ہم تو ہر پارٹی کو دیتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن مجھے ملت اسلامیہ کا خادم مت کہلواؤ کہ میرے کارخانے میں پونے دو سو مسلمان اس لیے نہیں کہ مجھے اُن کی پرورش کا شوق ہے۔

"شوکت میں کوئی عالم نہیں ہوں لیکن اپنے کام بھر کی باتیں جانتا ہوں۔ میں نے ہنری فورڈ کی سوانح عمری پڑھی ہے۔ جس نے ۱۹۰۸ء میں موٹر کا

کارخانہ قائم کیا تھا میرے کارخانے میں جو چونتیس سکھ حضرات ہیں، وہ زیادہ تر ماہر کاریگر ہیں اور کارخانے کو اُتنے ہی ماہر کاریگروں کی ضرورت ہے۔ جو اٹھائیس ہندو ہیں اُن میں سے کچھ دفتر کے بابو ہیں اور حساب کتاب دیکھتے ہیں اور کارخانے کے دیگر انتظامات سنبھالتے ہیں باقی جو پونے دو سو مسلمان ہیں وہ Unskilled لیبر ہیں جن کے پاس کوئی ہنر نہیں۔ اُن میں کچھ زور پشت پہلوان ہیں جو صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ ہمارے کارخانے میں کچھ کام ایسے ہیں جن کے لیے دونوں ہاتھ یا دونوں پیروں کی ضرورت نہیں۔ ایک ہاتھ اور ایک پیر سے بھی کام چل سکتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہم نے گیارہ ایسے مزدور بھرتی کیے ہیں جن کے صرف ایک ہاتھ یا ایک پیر ہے، دو اندھے بھی ہیں جو صرف ریگ مال کرتے ہیں۔ سرکار اپاہجوں کا سال منا رہی تھی، ہم نے بھی سُرخ روئی حاصل کرلی۔ لوگ سمجھے ہم بڑے خدا ترس ہیں، شائد لوگوں کو معلوم نہیں کہ خدا ترسی ایک الگ مشغلہ ہے۔ کارخانے کے ہنر مند سردار ہمارے پاس زیادہ دن نہیں ٹکتے بلکہ ہمارے کچھ سردار کاریگروں نے ہمارے یہاں کام کرتے کرتے ایک دن خود اپنے کارخانے کھول لیے۔ لیکن پونے دو سو بے ہنر مسلمان مزدوروں میں سے جو جہاں تھا وہیں آج بھی موجود ہے۔ کارخانے اسی طرح کی قناعت پر جیتے ہیں کہ ہمارے یہاں کبھی کام بند نہیں ہوا۔ مذہب اچھی چیز ہے اور ہمارے لئے بھی کام کی چیز ہے لیکن وہ ایک الگ قصہ ہے۔"

کوٹھی خاموش تھی۔ شہباز کا گرے ہاؤنڈ ایک نیم وحشی مگر کھوئی ہوئی نگاہ سے پاس ہی بیٹھا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اگر اُس کے پاس زبان ہوتی تو وہ آخری وفاداری نبھاتے ہوئے شوکت سے اتنا ضرور کہتا۔

"شوکت تمھیں اتنا پتہ ہے کہ ہمارا مالک دولت مند ہے اور اُس کے پاس بے حساب پیسہ ہے اور تم ایک خوبصورت، بے باک اور تیکھی سی لڑکی ہو جس کی آواز میں نقرئی کھنک ہے اور جس کی گفتگو میں گرم جوشی ہے اور جس کی مسکراہٹوں میں دلوں کو مسل دینے والی کیفیت ہے" اتنی بے پناہ بن کر شام کے جھٹپٹے میں اس اکیلی کوٹھی میں اکیلے مرد سے تم ملنے آئی ہو اُس کا سر تمھارے قدموں میں ہے۔ اُس کی ساری دولت لے لو لیکن اس کی تنہائیاں دور کر دو۔"

شہباز کو کئی بار ایسا لگا تھا جیسے اُس کی کوٹھی کی راہ داریوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنگ مرمر کے مجسموں میں شوکت کھڑی ہے۔ اور اس کی سانسوں سے کشید کیے ہوئے عطر اور آنکھوں کی جگمگاتی ہوئی روشنی سے اُس کے بے رنگ اور بے کیف سرسراتے ہوئے پردے معطر اور منور ہیں۔ کبھی اُسے لگتا کہ وحشتوں کے الاؤ میں قطرہ قطرہ پگھلتا ہوا شہباز شوکت کے خوبصورت، سڈول اور بے پناہ جسم کو قیمہ قیمہ کر کے اور اُس کے لوتھڑوں سے رستے ہوئے گرم گرم اور جوان اور کنوارے اور سرکش خون کو اپنے چلّوؤں میں بھر کر اپنی آنکھوں پر، چہرے پر، ہونٹوں پر، گردن پر، سینہ پر مل کر ساری رات اُس کی کٹی پٹی لاش کے بازو میں دھونی رمائے بیٹھا ہے اور اُس کے برہنہ

جسم پر شوکت کے خون کا ملا ہوا بھبھوت اُس کے انگ انگ میں
دہکتے ہوئے شعلوں کو دھیرے دھیرے خاکستر کر رہا ہے۔
کوٹھی کا دربان اپنے کوارٹر میں مرغی کی طرح اپنے بال بچّوں کو اپنے
پروں میں سمیٹے سوچ رہا تھا۔
"سُکھ اور دُکھ کیا ہے؟
"اپنا گھر بار چھوڑ کر وہ کس سلگتی ہوئی دوزخ میں آن مرا۔"
بیسوں پولیس والوں کی وردیاں اور جیپیں نظر آ رہی تھیں اور
زعفرانی کوٹھی دم بخود آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔
قدرت اللہ بکر قصاب کی دکان پر ایک روز بیٹھا کٹ چائے
پی رہا تھا جو بکر قصاب نے اُس کو منگا کر دی تھی۔ ابھی پائے چھیلے
جا رہے تھے کہ بکر قصاب قدرت اللہ سے بولا۔
"میاں آپ پالیٹکس میں کیوں آئے۔ قرآن قسم بڑا گندا کام ہے۔
کہاں چپڑے میں پڑ گئے۔ دنیا بھی خراب کی اور عاقبت بھی۔ مجھے اور
کچھ تو پتہ نہیں۔ بس اتنا بتا دو کہ آپ جو کچھ کرتے ہو کیا آپ کو خود بھی
اُس پر سچے دل سے ایمان ہے؟ کیا آپ اللہ کو گواہ کر کے کہہ سکتے ہو کہ
جو کچھ آپ کر رہے ہو وہ سولہ آنے ٹھیک ہے۔"
قدرت اللہ نے سینے میں بہت سی سانس بھری اور چھوڑ دی
کہ ایمان کہیں نہیں تھا، کہ شہر شہر، گلی گلی اور چھتوں چھتوں اور دروازہ
دروازوں سوالی ہی سوالی تھے جن کو ہر گھر سے اُن کے کشکول میں مٹھی دو

مُٹھی تشکیک، تنفر، بے اعتمادی اور بے یقینی کی بھیک دے دی جاتی تھی۔ شام کے جھٹپٹے میں پرندوں کے ساتھ اپنے ٹھکانوں پر واپس ہونے والے دن بھر کے تھکے ماندے یہ سوالی جب اپنے گھروں کو پہنچتے اور اپنے اپنے کمنڈلوں کی بھکشا اپنے اپنے دامنوں میں انڈیلتے اور اپنے ہونٹوں پر جمے دن بھر کے کڑوے کسیلے پن پر اپنی زبانیں پھیرتے تو ان کی عورتیں بھی اُنھیں مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی اُن کے پاس سے نکل جاتیں اور اُن کے بچے اُن کے ادھورے پن پر اُن کے خام، لسلسے، ناپختہ اور غیر معین وجود پر دو پل ٹھہر کر پیشاب بھی نہ کرتے اور پھر رات اُنھیں سلا دیتی اور پھر صبح اُنھیں اٹھا دیتی اور پھر دن اُنھیں تھکا دیتا کہ کسی کو کسی پر یقین نہیں تھا کہ بے یقینی کا مشغلہ ہی سب سے بڑا یقین تھا۔

شوکت نے کہا تھا ــــ

"بھیا تمھیں ایک بات بتاؤں!

"جب میں عام جنتا کے بیچ جاتی ہوں تو بار بار مجھے لگتا ہے کہ انھیں سرے سے میرے اوپر یقین ہی نہیں رہ گیا ہے۔ شاید میں اُن کو اُن کی جیسی نہیں لگتی ــــ اور تب مجھے لگتا ہے کہ کہیں گڑبڑ ہے۔ کوئی زبردست لنک رہ گیا ہے۔

"بھیا کیا تمھیں نہیں لگتا کہ ہم جس طبقے اور برادری سے تعلق رکھتے ہیں، ہماری جو روایت اور جو ماحول ہے اس میں یہ بابِ بیروالی نہیں

سن گلاس والی، آدھے کرتے کھُلے ساڑی والی۔ کچھ انگریزی اور کچھ بناوٹی ہندی بولنے والی شوکت جہاں ایک چلتا پھرتا فراڈ نظر نہیں آتی تھی پھر شوکت کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ہاں تو یہ کپڑے، یہ چمک دمک، یہ میک اَپ بدل بھی دیا جائے اور اُس کو ایک پروفیشنل ٹچ دے کر جیتا مارکہ حُلیہ بنا دیا جائے تو بھی ہماری آواز سے، ہماری آنکھوں لفظوں، لہجوں اور حرکتوں سے اخلاص اور اپنائیت کی وہ لہریں نہیں پھوٹتیں جو دوسروں کو ہماری طرف راغب کریں۔ میں کسی مخصوص پارٹی کی بات نہیں کر رہی، تم تو بالکل دوسرے ہی سیاسی مسلک کے آدمی ہو، بتاؤ تم کتنوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔

"ووٹر کب کدھر چلا جائے گا کوئی نہیں جانتا۔

"سیاسی کارکن کب کدھر لڑھک جائیں گے پتہ نہیں۔

"پارٹیاں کب اور کس سے الحاق یا علیحدگی کر لیں گی، کوئی نہیں کہہ سکتا۔

"اسمبلی کے چُنے ہوئے ممبر کب کس سے ساز باز کر لیں گے، کوئی بھروسہ نہیں۔

"بھیا کم عمر اور قبول صورت اور پُرکشش عورتیں ہماری برادری میں مرد کے لیے اب بھی ایک کموڈٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اندر بھی یقین معدوم ہوتا جا رہا ہے اور باہر بھی کہ اندر والے مجھے آنکھ مارتے ہیں اور باہر والے سیٹی بجاتے ہیں۔ آنکھ مارنے والوں پر مسکرادوں تو مشکل،

سیٹی بجانے والے پر ناراض ہو جاؤں تو مشکل کر ایک اجنتا ہے اور دوسری جنتا، یہ کیسا دباؤ ہے بھیّا، یہ کیسا دباؤ ہے۔"

مگر شوکت جہاں جس پر دباؤ بڑھ رہا تھا ایک دن قتل کر دی گئی۔

قدرت اُن دنوں بڑا اُداس تھا۔ وہ گرمیوں کی رات میں چھت پر لیٹے لیٹے اندھیرے میں کھڑی زعفرانی کوٹھی کے ہیولے کو دیکھتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہتا۔ اس کوٹھی کے کمپاونڈ میں شوکت کی لاش ایک بورے میں بھری ہوئی ملی تھی، قدرت اپنی چھت پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتا کبھی اُٹھ کر سرہانے کی صراحی سے پانی انڈیلتا اور پھر کروٹیں بدلنے لگتا —— اپنے آپ بڑبڑاتا۔

"تم بہت طاقتور ہو شہباز خاں

"میری بہن۔ میرے دل کی ڈھارس کو مجھ سے چھین لیا گیا ہے، مانا کہ میں قانون کا سہارا نہیں لے سکتا لیکن میں چھوڑوں گا نہیں۔

قدرت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُسے پہلی بار اپنے مہذب شہر کے شب و روز کی وہ رپورٹیں یاد آئیں جنھیں وہ اپنے اخبار کے کالموں میں مزے لے کر چھاپا کرتا تھا۔

اے گاؤں تیرے آموں کے باغوں میں، تیرے تالابوں اور کھیتوں میں پل دو پل بندوقیں چلا کر اور پٹاخے کر کے جانے والے عقلیت پسند تیری جذباتیت سے ڈرتے تھے کہ تیری زندگی بڑی تنگ تھی اور قتل بڑے عام تھے اور روپوش باغیوں کی آخری منزل ڈاکہ زنی تھی اور کھیت کھیت زنا

کے قصے تھے اور اس کی بیوی اس کے شوہر کے گھر بیٹھ جاتی تھی کہ لاٹھی، پھرسا، بلّم اور گنڈاسے فیصلوں کے ہتھیار تھے مگر شہر، ایک کم مایہ، بے مصرف مگر ہلاکت خیز غصے میں بھرے ہوئے یہ شہر کہ جہاں پولیس ہے، حکام ہیں، عدالتیں ہیں، قانون ہیں، یونیورسٹیاں ہیں، تہذیبی مراکز ہیں، انہی شہروں میں زعفرانی کوٹھیاں ہیں اور کوٹھیوں میں احاطے ہیں اور احاطوں میں لاشیں ہیں اور لاشوں پر چاقو کے زخم ہیں اور زخموں پر فنگر پرنٹ ہیں اور ساری کی ساری فنگر پرنٹ ہر ایک کی فنگر پرنٹ سے ملتی جلتی ہیں کہ یونیورسٹیوں میں آتش زنی ہوتی ہے کہ دن دہاڑے بینک لٹتے ہیں اور دلہن خودسوزیاں کرتی ہیں اور سرحد پر ڈائین. بروعالمی منڈیوں میں گاندھی کو Cash کر لیتا ہے جب کہ گبر سنگھ ٹھاکر کے ہاتھ قلم کر دیتا ہے اور بے بس ٹھاکر کی چیخ پکار کے ایل پی گلی گلی بجتے ہیں۔

"یہ ہاتھ ہمیں دے دے ٹھاکر

"یہ ہاتھ ہمیں دے دے۔

"نہیں

اور زخمی بروزلی کے پوسٹروں اور ڈسکو کی جلتی بجھتی روشنیوں اور کمسن بچیوں کی دریدہ اندام نہانیوں اور ریلوے لائنوں کی اکڑی ہوئی فش پلیٹوں اور خودسپردگی کرنے والے ڈاکوؤں اور اونچے اونچے اسکائی اسکریپر کھڑے کرنے والے اسمگلروں کے درمیان ہی کہیں سونے کا شہر ہے جس کا صدر دروازہ صرف ایک ہے اور چور دروازے بہت ہیں اور ان سب کے

بیچ قدرت اللہ ہے جس کے آگے بھی آدمی ہیں اور پیچھے بھی آدمی ـــــ
"سُنتے ہو شہباز خاں۔ میں تمھیں چھوڑوں گا نہیں کہ میری مددگار
بہن مجھ سے چھین لی گئی ہے۔"
اب قدرت کو اپنی منھ لگی بہن کی ایک ایک بات یاد آتی تھی۔
"بھیّا"
"ہاں۔"
"تم بہت بڑے ہو کس ہو۔"
"کیسے؟"
"بتاؤں کیسے؟"
دونوں میں تکرار ہوئی تھی بہن نے بھائی سے کہا تھا کہ وہ بہت کنفیوزڈ
قسم کا، اندر سے کہیں ڈرا ڈرا سا آدمی ہے۔ وہ اُس اونٹ کے مانند ہے
جو ریگستان کی ریت میں اپنا سر دے کر طوفان سے اپنے کو بچانا چاہتا
ہے اور اُسے خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہا ہے۔
"ڈری ہوئی تو تم بھی ہو" ـــــ قدرت مسکرا کر بولا تھا۔
"میں بھی شاید ڈری ہوئی ہوں۔ لیکن بھیا خوف شاید کبھی کبھی کام کی
چیز بن جاتا ہے ـــــ اس لیے کہ وہ متحرک بنا دیتا ہے۔ کبھی کبھی خوف ایک
ڈائرکشن بھی دیتا ہے۔ مگر تم۔ میرا مطلب ہے تمھارا خوف بہت پوچا
ہے اپنا سب کچھ دے کر تم اس خوف سے بچنا چاہتے ہو اور تمھاری سمجھ
میں یہ نہیں آتا کہ جب کچھ رہے گا ہی نہیں تو پھر خوف کس بات کا سبب

سے بڑی مشکل یہ ہے بھاگ کر ہر خوف سے اور بھی دوسرے خوف پیدا ہو جاتے ہیں۔

"اسی لیے جو نہتے، بے زور، بے زبان اور خوف زدہ پناہ گزیں بیروت کے کیمپوں میں سکڑے پڑے تھے انھیں کس خوف کے تحت مار ڈالا گیا ــــ اس لیے خوف کو صرف قبول کر کے بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے۔ اُس کی آنچ کو اپنے اندر اور بڑھاتے رہنا چاہیئے۔

"جب تک خوف Aggressive نہیں ہوتا" اُس کی کوئی جہت نہیں ہوتی۔

"قتل عام میں کام آنے والے اہم نہیں ہوتے، قتلِ عام کے بعد کی وحشت دیرپا اور اہم ہوتی ہے۔ تقسیم کے قتل عام میں مرنے والوں کو کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے بعد کی وحشت نے ہم سے بہت سے کام لے لیے ہیں۔"

"تو تم کیا چاہتی ہو؟ قدرت نے تیوریاں چڑھا لی تھیں۔ کیا تم پھر قتل عام چاہتی ہو۔"

"پاگل مت بنو" شوکت زخمی ہو کر بولی تھی۔

"میں صرف خوف کے احساس کو بڑھاوا دینا چاہتی ہوں، اتنا بڑھاوا کہ وہ ایک قوت بن جائے۔ گاندھی نے بھی یہی کیا تھا۔ غلامی کے خوف کو اتنا بڑھاوا دیا کہ وہ ایک قوت بن گیا۔ میں فریم بدلنا نہیں چاہتی، فریم کی تصویر کو کچھ نئے رنگ دینا چاہتی ہوں۔"

قدرت چپکے سے نظریں نیچی کرتے ہوئے بولا تھا۔

"تم مسلم فرقہ پرست ہو۔"

"مسلم فرقہ پرستی ہو یا ہندو فرقہ پرستی۔ ان دونوں کے Revival کے علاوہ ہم پچھڑے ہوئے لوگ اور کر بھی کیا سکتے ہیں کہ بھیا ہمارے بڑے بھائیوں نے ہماری ہمتیں کھو دی ہیں۔ قومیں ہوں یا تاریخ یا افراد خالی تو بیٹھ نہیں سکتے، کچھ نہ کچھ تو کرتے رہنا ہے۔"

شوکت کو اپنے بھائی کے جملے پر بڑی ہنسی آتی تھی۔ فرقہ پرستی والی بات پر اُس نے اپنی ساڑی سمیٹی تھی اور اپنا پورٹ فولیو بغل میں دبایا تھا اور بوجھل قدموں سے باہر جاتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکی تھی۔

"ابھی کچھ سال پہلے تک ہمارے سامنے راستہ بڑا صاف تھا۔ لیکن اب تو سب کچھ اُلجھ چکا ہے۔ یہ بات الگ ہے بھیا کہ مجھے فرقہ پرستی سے اُتنی ہی نفرت ہے جتنی کسی نمازی کو کتے سے۔"

اور پھر ایک رات کچھ اس طرح ہوا۔

ایک لمبی چوڑی گاڑی قدرت کے دروازے پر رُکی۔ ڈرائیور نے دستک دی، اندر سے ایک زنانی آواز نے استفسار کیا۔ ڈرائیور نے قدرت کو پوچھا۔ اندر سے جواب ملا۔ ابھی نہیں آئے۔ ڈرائیور نے ہدایت کی جب آئیں تو کہیں شہباز میاں نے سلام کہلوایا ہے اور کہا ہے کہ جب بھی آئیں گے آج رات کا کھانا میاں اُنھیں کے ساتھ کھائیں گے

گیارہ کا عمل تھا کہ قدرت تھکا ماندا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی نے پیغام دیا تو قدرت سوچ میں پڑ گیا۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہارن

کی آواز سنائی دی ۔ بڑی کیڈیلاک کا ہارن ۔ قدرت چُپ چاپ گردن جھکائے اس جانی پہچانی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی زعفرانی کوٹھی کے احاطے میں جب رکی تو آسمان پر بجلی چمک رہی تھی اور کیاریوں میں گل داؤدی جیسے انگاروں پر لوٹ رہے تھے اور پورٹیکو سے لپٹی منی پلانٹ کی بیل کے سرسبز و شاداب پتّے اس اندھیری اور ویران رات کی بوندا باندی میں چپکے چپکے رو رہے تھے

اندر دو کمروں سے گزر کر ایک راہ داری کو پار کر کے تیسرے کمرے میں جہاں فرش پر سُرخ اور دبیز کارپٹ بچھا تھا اور چھت سے قیمتی فانوس لٹک رہا تھا اور ایک دیوار کے بیچوں بیچ آدی باسی طرز کا تیر کمان سجا ہوا تھا اور شہباز خاں کا چہرہ لٹکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بے قراری اور بے چینی تھی اور وہ کارپٹ پر بے ارادہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہل رہا تھا۔

" قدرت میاں بیٹھ جائیے۔"

وہ قدرت کی طرف دیکھے بغیر بولا اور خود ٹہلتا رہا۔ قدرت بیٹھ گیا اور دھیرے سے بولا۔

" کیوں بلایا ہے آپ نے ؟"

شہباز کی طرف سے خاموشی رہی۔ پھر سکوت ٹوٹا

" اس رات کے بعد سے میں سویا نہیں، پر اب مجھے نیند آئے گی"۔۔۔

شہباز جیسے غرّا رہا تھا۔

"یہ ہیں وہ خط جو میں نے شوکت کو لکھے تھے اور جنھیں ایک دن وہ مجھے واپس کر گئی تھی۔"

چند خطوط میز پر سے اٹھا کر قدرت کی جانب شہباز نے بڑھا دیئے۔

"ان خطوں میں نہ تو تم کو عشق و عاشقی کا کوئی مضمون ملے گا اور نہ کوئی عامیانہ پن کہ نہ تو اب میری وہ عمر ہے اور نہ مزاج۔ شوکت نے سادے جوابات زبانی دے دیئے تھے۔ مجھے کوئی خط نہ لکھا۔"

قدرت نے ان خطوں کو کھول کر نہیں دیکھا۔ وہ شہباز خاں کو گھور رہا تھا۔

"دراصل میں نے تمھیں خط پڑھنے کے لیے بلایا بھی نہیں۔ اس لیے بھی نہیں بلایا کہ شوکت سے اپنے عشق کی داستان سناؤں۔

"دراصل مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میں پیسہ کمانے اور خرچ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میں ان دونوں کاموں کے علاوہ بھی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اور میری اسی غلطی پر تمھاری شوکت ماری گئی۔"

شہباز اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ روک رہا تھا اپنے کو مگر ایسا نہ ہو سکا۔ وہ بکھرے بکھرے جملے بولنے لگا۔

"اگر میں اس کو اٹھوا لیتا اور ریپ کر دیتا تو ___؟"

"کیا ہوتا ___؟ اس کی قیمت ہی تو ادا کرنی پڑتی۔"

"اس طرح میں وہی کرتا جو کمانے اور خرچ کرنے والے کرتے ہیں۔ لیکن اب میں آرام سے سو سکوں گا کیونکہ میں نے جان لیا ہے کہ اس کو کن لوگوں نے مارا ہے۔"

"کون ہے شوکت کا قاتل؟" قدرت کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔
"تم اُسے نہیں مار پاؤ گے۔ کیونکہ تم زیادہ سے زیادہ اپنی بے بس بیوی پر مٹی کا تیل چھڑک کر ماچس دکھا سکتے ہو یہ کہنے کے لیے کہ کھانا پکاتے میں جل کر مر گئی۔
قدرت نے یکایک شہباز کے دامن کو دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیا اور اُس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے تقریباً چیخ پڑا۔
"مجھے بتادو شہباز میاں مجھے بتادو۔"
اور پھر قدرت جو بہن کے مرنے کے بعد ایک آنسو بھی نہیں بہا پایا تھا' پھوٹ پڑا۔
"کتنی عجیب بات ہے" شہباز خاں گمبھیر ہو کر بولا۔ "جو ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ ہمیں اپنے سے بہت زیادہ آگے نہیں جانے دیتے۔"
شہباز صوفے پر بیٹھ لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔
"وہ سمجھتے تھے کہ شوکت میرے پاس آتی ہے۔ ایک دن وہ میرے بستر کی زینت بنے گی اور پھر اُن کے لیے راستے کھل جائیں گے اور وہ اُسے شہر سے دور کسی پُر فضا ٹھکانے پر کسی کانفرنس میں لے جائیں گے' اُس کو شراب پلائیں گے' کپڑے اُتاریں گے' گردیں جھکا کر تصویریں کھنچوائیں گے اور پھر ساری زندگی اپنے انگوٹھے کے نیچے رکھیں گے یا پھر شکاری کی ٹرافی کی طرح دیوار پر ٹانگ دیں گے جیسے شکاری بارہ سنگھے کا سر ٹانگ دیا کرتے تھے۔"
شہباز کی آنکھیں یہ کہتے ہوئے نم ہو گئی تھیں اور اُس کے ہونٹوں کے

گونوں پر اُس کے مُنھ کا لعاب جھانک رہا تھا۔

"پتہ نہیں تم یہ بات جانتے بھی ہو کہ نہیں کہ شوکت جہاں ناطاقتی سے چھٹکارا پانے کی ایک کوشش کا نام تھا۔ ہم مرد لوگ عورت کے اندر تڑپتی ہوئی اس چھٹپٹاہٹ کی بُو کو دور سے محسوس کر لیتے ہیں۔ اس بُو کو حاصل کرنے کی طاقت ہم کو ہمارے کمینے پن سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک دن شوکت نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھ لیا تھا۔

"یار شہباز میاں یہ بتاؤ کہ ہم تم کو کیسے لگتے ہیں؟"

"بہت اہم" ___ میں نے سنجیدگی سے کہا تھا ___ "بہت ریلیونٹ۔"

"لیکن ہمارے اندر جو کچھ کم ہے وہ کیسے پورا ہوگا؟"

بڑی سمجھداری سے شوکت نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔

یہ کہہ کر شہباز کی آواز میں اُداسی سی آگئی

"ہم سب کے اندر کہیں کچھ کم ہوا کرتا ہے۔ ہمیں بس دھندلا سا پتہ ہوتا ہے کہ کچھ کم ہے۔ میرے اندر گوشت کچھ کم تھا جسے شوکت پورا کر سکتی تھی۔ تب ہی تو اُسے دیکھ کر میری آنکھیں روشن ہو جایا کرتی تھیں۔ میں نے ایک انجانے ڈر کے مارے کبھی اُس کو چھوا نہیں۔ اتنی دیر اور اس طرح کبھی نہیں چھوا کہ میرا جسم بے چین اُٹھے۔ اگرچہ میں پھر بھی اُسے تھوڑا سا چھو لینے کے بہت سے بہانے نکالتا رہتا تھا۔

"کاش قدرت میاں تم جان سکتے کہ شوکت کے یہاں کیا کم تھا۔ اُس کے چاروں طرف جو حلقہ تھا، وہ لوگ جن کی وہ خاطر مدارات کرتی تھی؛ وہ جیسے

جن میں وہ گھومتی تھی، وہ خوش باش جو اسے اپنے پہلو میں بٹھا کر سیاست کے داؤں پیچ سکھاتے تھے وہ سب اُسے ایک ایسی چادر میں ڈھکنا چاہتے تھے جس کے نیچے سب کچھ دکھائی دیتا رہے۔ اُس کی کمزوریاں، اُس کی محرومیاں اور اُس کی تمنائیں۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہ میری طرف بڑھ رہی ہے اور میں اُسے وہ تحفظ دے سکوں گا جس کے پیچھے اُنھیں اس کا کچھ بھی دکھائی نہ دے گا تو اُنھوں نے اُس کو ختم کر دیا۔"

یہ کہہ کر شہباز کھڑکی کے اُس پار دیکھنے لگا۔ وہ خاموش تھا، اُس کے ہونٹوں پر ایک کڑوی سی مسکراہٹ تھی جو قدرت دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو اگر بول پڑتی تو قدرت سے یوں مخاطب ہوتی:۔

"اتنی سی بات پر کوئی کسی کو ختم نہیں کرتا قدرت میاں ۔۔ تم بہت بھولے ہو، شہباز تمھیں اُس رات کی بات نہیں بتائے گا اور تمھارے حق میں اس کا نہ جاننا ہی بہتر ہو گا کیونکہ تم بہت بے بس ہو، بہت مجبور ہو اور اسے جان کر تمھارا درد و غم کچھ اور بڑھ جائے گا اور تم کچھ نہ کر پاؤ گے۔

"اُس رات۔ جب شوکت ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد دھیرے سے بولی تھی۔

"بہت سے لوگوں کو اب یہ پتہ ہو چکا ہے کہ طاقت بہت دنوں کسی کا ساتھ نہیں دیتی اور کبھی بھی ہاتھ سے پھسل جانے والی طاقت جب قبضہ میں آجائے تو اُسے سنبھالے رکھنے کے لیے اور زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اور پھر اُس نے شہباز کو بتایا تھا کہ وہ ایک ایسے مہذب مافیا کی لپیٹ

میں ہے جو ظاہری طور پر اور اپنی اوپری سطح میں سیاست کے میدان میں سرگرم ہے لیکن اندرونی طور پر طاقت کے خزانے میں سیند لگانے میں مصروف ہے۔ وہ دھیمے لہجہ میں گردن جھکا کر بولی تھی۔

"شہباز میں تمھارے نکاح میں نہیں آسکتی۔ میری حفاظت اب کسی ایک مرد کا مسئلہ نہیں کیونکہ میں ایک فرد نہیں ایک گروہ ہوں۔ میں ایک عورت نہیں ایک پرزہ ہوں جو پوری مشین میں تو اہم ہے مشین کے باہر بے معنی۔"

"کیا تم کسی سے ڈر رہی ہو ۔۔" شہباز نے پوچھا تھا۔

"ہاں ۔۔"

"کس سے ؟"

"گروہ سے کہ اکیلا کوئی کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"تو باہر نکل آؤ۔"

"نہیں یہی تو ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ۔۔ ؟"

"باہر آکر بھی ایک گروہ میں ہی جی سکتی ہوں۔ اگر گروہ نہیں ہو گا تو بنانا پڑے گا۔ اُسی طرح جس طرح کوئی ڈاکو جب اپنے گروہ کو چھوڑتا ہے اور اُسی شان سے زندہ رہنا بھی چاہتا ہے (جو کہ وہ چاہتا ہی ہے) تو پھر وہ تنہا نہیں بنتا۔ اس گروہ کے برابر یا اس سے زیادہ طاقت ور گروہ بنا کر کام میں لگ جاتا ہے۔"

"لیکن تم تو متوسط گھرانے کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہو۔"

"کبھی تھی ۔"

"کیا مطلب ۔"

"مطلب یہ کہ اب نہیں ہوں ۔"

"بس دو چار سال میں ہی ایسا کون سا انقلاب آ گیا ۔"

"انقلاب کی بات مت کہو یار شہباز خاں ۔ ابھی کتنے دن ہوئے جب گاندھی نے ودیشی چیزوں کے خلاف نعرہ لگایا تھا ۔ اب غیر ملکی گاڑیاں دوڑتی ہیں ، چرخہ کوئی نہیں کاتتا ، کھدر سب پہنتے ہیں ۔ وہ گاندھی جی کی مجبوری تھی ، یہ ہماری مجبوری ہے کہ شہباز میاں اب دو چار سال دو چار صدیوں کے برابر ہیں اور یہ بات ٹھیک ہی ہے کہ اب شوکت ۔ بہت بدل چکی ہے یا بدلی جا چکی ہے اور جب یہ سب ہو چکا تو شوکت پر یہ راز کھلا کہ اب وہ کسی کی پرائیویٹ پراپرٹی نہیں رہی ۔ شہباز خاں میرے اوپر کسی ڈیم کی طرح بہت خرچ ہو چکا ہے ۔ میرے ذریعے سے بہتوں کا بہت کچھ داؤں پر لگا ہے کہ عورت ذریعہ تلاش کرنے والی دنیا میں ایک بہت کارآمد ذریعہ ہے ۔ دوہری زندگی ، دوہرا معیار ، دوہری چالیں ۔ پہلے ہم جو کچھ دنیا پسند نہیں کرتے تھے اُسے اب کھوتے ہوئے ہمیں شرم نہیں آتی کیونکہ اب جو کچھ ہم پانا چاہتے ہیں وہ ایک بے کار اور بے مصرف سی چیز تھی ۔ پہلے للکار کر جان لی یا دی جاتی تھی اور طاقت پائی یا کھوئی جاتی تھی ۔ اب تو کیسے کیا کچھ اور کتنا مل سکتا ہے ، غصب کیا جا سکتا ہے چُرایا جا سکتا ہے ، چھینا جا سکتا ہے ، یہ اہم ہے ۔ اگر کسی دن مار دی جاؤں تو سمجھ لینا کہ

میں اپنی ناطاقتی سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں ایک آگ کے پل سے گزر رہی تھی کہ پیر پھسل گیا۔

"کیا تمہیں اپنی جان کا خطرہ ہے؟" شہباز نے کانپتی ہوئی آواز میں شوکت سے پوچھا تھا۔

"ایک خوف ضرور ہے۔" اُس نے جواب دیا تھا۔

"لیکن کیوں ۔؟"

"جہاں conviction نہیں ہوتا وہاں خوف ہوتا ہے" وہ بولی تھی ۔ "اور میں اس انبوہ میں شامل ہوں جس کے پاس صرف خوف اور یہ انبوہ جان چکا ہے کہ سیاست اب اپنی Myth کی آخری قوت بھی خرچ کر چکی ہے"۔

شوکت سے ملاقات کی وہ رات، شہباز کو شوکت کی ایک ایک بات یاد تھی ۔ قدرت سمجھتا تھا کہ شہباز کو شاید شوکت کے قاتل کا سراغ مل چکا ہے۔ وہ بڑی عاجزی سے شہباز سے بولا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے ٹھیک ٹھیک اس آدمی کا نام بتا دو جس نے شوکت کو مارا ہے۔"

"نام جاننے کے بعد کیا ہو گا۔؟"

"میں اسے مار ڈالوں گا۔"

شہباز ایک تلخ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لا کر کچھ دیر خاموش رہا تھا اور پھر بولا تھا۔

"زندگی میں بڑے تحمل کے بعد اس راز سے پردہ اُٹھتا ہے کہ کسی کو جینے کے لیے اُسے کیسے زندہ رکھنا چاہیے۔ زندہ رکھنا ایک فن ہے لیکن مارنا یا قتل کرنا بھی ایک تہذیب ہے۔ اگرچہ آج کوئی کسی کو بھی مار سکتا ہے لیکن اصل معاملہ موت کو انٹرپریٹ کرنے کا ہوتا ہے' اُسے معنی دینے کا ہوتا ہے۔ تم اُسے مار تو سکتے ہو لیکن اُس کی موت کو معنی نہیں دے سکتے۔ اس لیے صبر کرو اور یہ کام اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دو جو اس فن سے واقف ہیں۔"

قدرت اللہ شہباز کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور شہباز سوچ رہا تھا کہ کیا وہ قدرت کو بتا دے کہ غنیم کون ہے اور کن ہتھیاروں سے لیس ہے اور ہم اُسے کیوں زندہ رکھیں گے۔ یہاں تک کہ الیکشن کا زمانہ قریب آئے گا تو ہم اُس کو ہریجنوں کے کسی گاؤں کے قریب چھوٹے سے' ویران سے رسٹ ہاؤس میں ٹھہرا دیں گے اور وہاں اُسے شرابیں اور چھوکریاں دلوایا کریں گے اور پھر جب ایک رات بڑا اندھیرا ہوگا۔ جب وہ اپنے رسٹ ہاؤس کے بستر پر ہماری ہی سپلائی کی ہوئی کسی بے سہارا ہریجن عورت کے ساتھ سو رہا ہوگا اور جب دونوں کی باہیں ایک دوسرے کو کسے ہوں گی بس تب ہی دونوں کی گردنیں گنڈاسے سے کٹی پڑی ہوں گی اور پولنگ ہونے میں صرف دو روز باقی رہ گئے ہوں گے اور سیاست کی دیومالا کی بچی کچی طاقت اپنا رنگ دکھا رہی ہوگی اور پانسہ پلٹ جانے کا خوف تفتیش کے ہاتھ جکڑ چکا ہوگا اور زعفرانی کوٹھی کے احاطے کے پیڑ پودوں پر رنگین قمقمے جل رہے ہوں گے اور امرا و منصب داروں کی گاڑیوں کو ہاتھ دکھاتا ٹرافک کانسٹبل انھیں کوٹھی کے ایک کنارے

پارک کردار ہا ہوگا اور لان پر کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کے ساتھ ایک کونے میں سلیقہ سے سجے ہوئے بینڈ باجے کی ترنم خیز لہریں اٹھ رہی ہوں گی تب اُس گھڑی، اُس پل شہباز خاں اپنے Living Room میں پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہوگا کہ ہر طرف ایک ایسی چادر پڑی ہے کہ جس کے نیچے سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔

لیکن شہباز نے قدرت کو کچھ نہیں بتایا۔

اندر ہی اندر کھولتا ہوا شہباز خاں کھانے کی میز پر سے اٹھا اور باتھ روم میں جا کر اُلٹیاں کرنے لگا۔

قدرت کی خالی خالی سی آنکھیں ویسے ہی تپ رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی پر پتھر ہو چکا تھا۔

باہر منی پلانٹ سے آنسو رس رہے تھے اور احاطے کے اُس پار کوٹھی کے آہنی پھاٹک کی برساتی میں تعینات گورکھا، نصف شب کے گجر کے انتظار میں کھڑا سوچ رہا تھا

باہر منی پلانٹ سے آنسو رس رہے تھے اور احاطے کے اُس پار کوٹھی کے آہنی پھاٹک کی برساتی میں قنات گورکھا کھڑا سوچ رہا تھا

میاں کے دیدار کیا ہوئے؟ کیا یہاں کبھی کوئی جنگل تھا

نمی سے بوجھل ماتا بھری ہوائیں کب چلیں گی؟

یکایک گورکھا کے بوڑھے اور مسخ شدہ چہرے پر چوندھیا دینے والی روشنی پڑی۔ گاڑی قدرت اللہ کو گھر چھوڑنے واپس جا رہی تھی۔